جلد ۲۰ و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جون ۱۹۷۳ء

* مدیر مسؤل *

ڈاکٹر اسرار احمد
ایم بی-بی-ایس (پنجاب) ایم-اے اسلامیات (کراچی)

* یکے از مطبوعات *

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

۱۲ - افغانی روڈ ، سمن آباد ، لاہور (فون : ۶۸۲۴۵)

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

عرض احوال

قارئین ' میثاق ' اس اطلاع سے یقیناً آپ خوش ہوں گے کہ :

۱- مولانا امین احسن صاحب' کی شاہکار تالیف ''حقیقت دین ، مشتمل بر حقیقت شرک ، حقیقت توحید ، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز پریس میں جا چکی ہے - ۱۸ × ۲۲/۸ سائز کے ۳۳۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت دبیز عمدہ آفسٹ پیپر پر طبع ہو رہی ہے اور مجلد کتاب کا ہدیہ صرف ۱۲/- طے کیا گیا ہے -

۲- امام حمید الدین فراہی رح کا مجموعہ تفاسیر بھی اب پریس کے حوالے ہونے ہی والا ہے - اس کے ۲۹/۸ × ۲۲ پر ۵۳۶ صفحات بنے ہیں - کاغذ نہایت عمدہ حاصل کیا جا چکا ہے - اس کا ہدیہ ۲۴/- طے ہوا ہے -

۳- تدبر قرآن کی جلد سوم بھی اب تصحیح کے دور ثانی کے تکمیلی مراحل میں ہے - اس کے لئے بھی کاغذ حاصل کیا جا چکا ہے - یہ ۲۹/۸ × ۲۲ سائز کے ۸۰۸ صفحات پر مشتمل ہو گی - اور اس کا ہدیہ ۳۶/- ہوگا - اس میں سورۂ بنی اسرائیل تک کی تفسیر شامل ہے -

۴- مقدمہ تدبر قرآن و تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ ، ایک علیحدہ کتابچے کی صورت میں شائع ہو رہی ہے اور اب جزو بندی کے مراحل میں ہے ۲۹/۸ × ۲۲ کے ۶۴ صفحات پر مشتمل اور وہائٹ بورڈ کے کور سے مزین اس کتابچے کا ہدیہ اشاعت عام اور افادہ عوام کی غرض سے صرف ۲/- رکھا گیا ہے -

۵- 'اسلام کی نشاۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام ' کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور اب وہ چار ہزار کی تعداد میں زیر طبع ہے -

۶- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ، کا انگریزی ترجمہ از قلم پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے انگریزی مجلہ Islamic Education کی اشاعت بابت مارچ اپریل میں شائع ہو گیا ہے - میثاق کے مستقل خریداروں کو اس کی ایک ایک کاپی ارسال کرا دی گئی ہے اور یہ ان کے سالانہ چندے میں محسوب ہو جائے گی -

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کتاب عزیز کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے -

اسرار احمد عفی عنہ

ماہنامہ
میثاق
لاہور

شمارہ-۶	جون ۱۹۷۳ء	جلد ۲۰

فہرست مضامین

• عرض احوال ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ اسرار احمد کور کا اندرونی صفحہ ۲

★ تذکرہ و تبصرہ

• نجات کی راہ، سورہ والعصر کی روشنی میں ــــ ــــ اسرار احمد ۲

★ تدبر قرآن

• تفسیر سورۂ یونس (آخری قسط) ــــ ــــ مولانا امین احسن اصلاحی ۲۵

★ مقالات

• جمع و تدوین قرآن (۲) ــــ ــــ ــــ ــــ صدیق حسن ۵۲

★ روداد انجمن

• روداد اجلاس عام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ــــ چوہدری نذیر احمد ۷۳

• روداد اجتماع مجلس عمومی انجمن خدام القرآن کراچی شیخ جمیل الرحمٰن ۷۷

• گوشوارہ آمد و خرچ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کور کا اندرونی صفحہ ۳

• رفتار کار حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کراچی " آخری صفحہ ۴

مرکزی انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ ۱۲- افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور

(فون: ۶۸۲۴۵)

تذکرہ و تبصرہ
اسرار احمدؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
تبصرۃً وذکریٰ لکل عبدٍ منیبٍ ۝

نجات کی راہ
سورۃ والعصر کی روشنی میں

[اس عنوان سے راقم الحروف کی ایک تحریر آج سے تقریباً ساڑھے چھ سال قبل نومبر ۱۹۶۶ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت چونکہ ایک مقالے کی سی تھی لہٰذا اس میں اجمال کا رنگ بھی تھا اور اس کی زبان بھی قدرے مشکل تھی۔ اب اس سال اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرما دی کہ محترم پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج لاہور نے راقم کو کالج کے سٹاف اور سینئر سکول کے طلباء کے مشترکہ اجتماع میں درسِ قرآن کی دعوت دی۔ تو راقم نے سب سے پہلے سورۃ والعصر کے مضامین کو بیان کیا۔ اور اگرچہ اساتذہ کرام اور بعض دوسرے مہمان حضرات کی رعایت سے بعض دقیق مضامین کی جانب بھی اشارے کئے لیکن طلباء کی رعایت سے عام طور پر زبان بھی سہل رکھی اور تشریح و توضیح میں بھی ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھا۔ مزید برآں ان کے تعلیمی پس منظر کی رعایت سے اکثر مقامات پر انگریزی کے مترادفات کے استعمال سے ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

محترم پرنسپل صاحب نے اس تقریر کو ٹیپ پر محفوظ کرانے کا اہتمام پہلے سے کر لیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اسے صفحۂ قرطاس پر بھی منتقل کرا لیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اس پر نظر ثانی کر دوں۔ تاکہ اسے شائع کرایا جا سکے۔ چنانچہ راقم نے ضروری حک و اضافے کے بعد اسے اشاعت کیلئے ان کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے افادۂ عام کی غرض سے 'میثاق' میں بھی شائع کر دیا جائے۔ ——— اس سلسلے کی دوسری تقریر جو آیۂ برّ (سورۂ بقرہ، ۱۷۷) کی روشنی میں "نیکی کی حقیقت" کے موضوع پر ہوئی تھی اسی طرح پہلے ٹیپ اور پھر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر نظر ثانی کیلئے راقم کو موصول ہو چکی ہے، خدا نے چاہا تو آئندہ شمارے میں وہ بھی شائع کر دی جائے گی۔ اسرار احمدؒ]

خطبہ مسنونہ، تلاوت سورۃ والعصر اور دعا کے بعد :

محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ !

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل و کرم سے ایسی سہیل پیدا فرمادی کہ آج پاکستان کی اس بلند پایہ درس گاہ میں مطالعہ قرآن حکیم کی ہفت روزہ نشست کا آغاز ہو رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگرچہ ظاہری اسباب و وسائل کا بالکل انکار تو نہیں کیا جاسکتا لیکن اصلاً سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت و تدبیر سے ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ!

اس کے بعد میں پرنسپل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یہاں حاضر ہو کر اظہار خیال کا موقع عنایت کیا۔ اور اساتذہ اور طلبا میں سے بھی جنہوں نے اس اجتماع کے اہتمام میں حصّہ لیا ہے ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جہاں تک مطالعۂ قرآن حکیم کی اہمیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں آج میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ انشاء اللہ العزیز اس کے مواقع بعد میں ملتے ہی رہیں گے۔ بلکہ خدا نے چاہا تو ایک نشست خاص اسی موضوع کے لیے وقف ہوگی۔

آج کے لیے میں نے طے کیا ہے کہ سورۃ والعصر کا مختصر مفہوم آپ کے سامنے بیان کروں۔ اس انتخاب کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دینیات کے نصاب میں ایک سلسلہ کتب شامل ہے جس کا نام ہے "THE RIGHT PATH"۔ چونکہ سورۃ والعصر کا بنیادی مضمون بھی یہی ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ مطالعہ قرآن کے سلسلے کا آغاز اسی مبارک سورت سے کیا جائے۔

(۱)

سورۃ والعصر کے بارے میں چار بنیادی باتیں

سب سے پہلے اس سورۃ مبارکہ کے بارے میں چار بنیادی باتیں ذہن نشین کرلیں :

۱۔ ایک یہ کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی اوّلین سورتوں میں سے ہے۔ گویا کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکّی دور کے بالکل آغاز میں نازل ہوئی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہ قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ یہ کل تین آیات پر

مشتمل ہے اور ان میں سے بھی پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے ۔ یعنی " وَالْعَصْرِ ۝ "

۳ ۔ تیسرے یہ کہ اپنے مضمون اور مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے ۔ اس لیے کہ قرآنِ مجید کتابِ ہدایت ہے (هُدًى لِّلنَّاسِ) ۔ یعنی انسان کو کامیابی اور فوز و فلاح کا راستہ دکھانے کے لیے نازل کیا گیا ہے تاکہ انسان نجات (SALVATION) کو حاصل کر سکے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نجات کی جس راہ کی جانب لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے وہ نہایت اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ اس چھوٹی سی سورت میں بیان ہو گئی ہے ۔ اس اعتبار سے مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پورا قرآن مجید ایک درخت کے مانند ہے اور یہ چھوٹی سی سورت اس کا بیج ہے اور جس طرح ایک بیج میں پورا درخت پنہاں ہوتا ہے اسی طرح سورۂ والعصر میں پورا قرآنِ حکیم موجود ہے

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان میں سے دو حضرات کی ملاقات ہوتی تھی تو وہ جدا ہونے سے قبل ایک دوسرے کو سورہ والعصر ضرور سنایا کرتے تھے ۔

اور یہی سبب ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورتِ مبارکہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر لوگ صرف اس ایک سورت پر غور کریں تو یہ ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے ۔ بلکہ ان کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر قرآن مجید میں اس سورت کے سوا اور کچھ نازل نہ ہوتا تو یہی ایک سورت ان کی ہدایت کے لیے کافی ہوتی ۔

۴ ۔ چوتھے یہ کہ اس سورت کے الفاظ بہت سادہ اور آسان ہیں ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر زبان میں اس کے ادب کے شاہکار وہ ادب پارے قرار دیئے جاتے ہیں جن میں مضامین اور معانی تو بہت اعلیٰ اور بلند پایہ ہوں لیکن الفاظ نہایت آسان اور عام فہم ہوں ۔ ایسے ہی ادب پاروں کو سہل ممتنع قرار دیا جاتا ہے ۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اوّل کو پورا قرآن مجید ہی عربی زبان کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور کُل کا کُل ہی سہل ممتنع ہے لیکن اس میں بھی خاص طور پر یہ سورۂ مبارکہ تو سہل ممتنع کی اعلیٰ ترین مثال ہے ۔ جس میں مضامین کے اعتبار سے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے لیکن تفصیل اور بھاری بھرکم لفظ ایک بھی استعمال نہیں ہوا ——— یہاں تک کہ ایک عام اردو دان شخص کے لیے بھی اس میں کوئی لفظ نہ نامانوس ہے نہ مشکل ۔

مثلاً اس کا پہلا لفظ ہے ' والعصر ' اور عصر کا لفظ ہماری عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے جیسے عصرِ حاضر ، ہمعصر لوگ وغیرہ ، اسی طرح انسان کا لفظ تو گویا ہے ہی اردو کا ۔ پھر خُسْرٍ کو

دیکھئے تو خسارہ، خسران وغیرہ الفاظ کا ہم عام استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایمان، عمل صالح، حق اور صبر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ہماری ہی زبان کے الفاظ ہیں۔ بعض حروف جیسے اِنَّ، کَفٰی اور اِلَّا کے علاوہ صرف ایک لفظ یعنی "تَوَاصَوْ" ذرا نامانوس ہے لیکن اس کا بھی مصدر یعنی وصیت ہماری بول چال میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

فہم قرآن کے دو درجے

اس مبارک سورت کا مفہوم بیان کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ ایک بنیادی بات آپ کو بتا دوں۔ اور وہ یہ کہ فہم قرآن کے بہت سے مراتب ہیں جن میں سے اوّلین یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت یا سورت میں جو اصل سبق (LESSON) پنہاں ہو اسے اخذ کر لیا جائے اور اس سے بنیادی رہنمائی (BASIC GUIDANCE) حاصل کر لی جائے۔ اسے خود قرآن مجید نے "تَذَکَّرْ بِالْقُرْآن" کا نام دیا ہے اور اس کے اعتبار سے قرآن مجید نہایت آسان کتاب ہے۔ اس کے برعکس قرآن پر غور و فکر کی بلند ترین سطح وہ ہے جسے قرآن نے "تدبّرِ قرآن" قرار دیا ہے، یعنی یہ کہ ہر ہر لفظ کی گہرائی میں اتر کر اس کے معانی پر غور کیا جائے اور قرآن کے فلسفہ و حکمت کو اخذ کیا جائے۔ اس پہلو سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے اور اس کے معانی کی تہہ تک پہنچنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔

آج کی اس مجلس میں میں سورۂ والعصر کا مفہوم مقدّم الذکر اعتبار سے قدرے تفصیل سے بیان کروں گا تاکہ اس سورۂ مبارکہ کی بنیادی تعلیم اور اس کی اصل رہنمائی پوری طرح واضح ہو جائے۔ اور پھر کچھ مختصر اشارات موخر الذکر طریق پر بھی کروں گا تاکہ سوچنے سمجھنے والوں کو مزید غور و فکر کے لیے رہنمائی حاصل ہو جائے۔

(۲)

ترجمہ

اس سورۂ مبارکہ کا سادہ ترین الفاظ میں ترجمہ یہ ہے:

"زمانے کی قسم ہے۔ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ ماسوائے اُن کے جو ایمان لائے، جنہوں نے اچھے عمل کئے، باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم

ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کی !"

عبارت کا تجزیہ (ANALYSIS)

ذرا غور کیجئے تو صاف نظر آجائے گا کہ اگرچہ اس مبارک سورت میں آیات تین ہیں لیکن ان تینوں سے مکمل جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے۔ دوسری میں ایک قاعدہ کلیہ۔ (GENERAL RULE) بیان ہوا ہے اور تیسری میں اس قاعدہ کلیہ سے ایک استثناء (EXCEPTION) کا بیان ہے اور تینوں آیات مل کر ایک سادہ سی بات (SIMPLE STATEMENT) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سادہ سے فقرے کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ذرا سے غور و فکر اور سوچ بچار سے چار نتائج اخذ کریں جو گویا کہ اس سورۂ مبارکہ کا اصل حاصل اور بنیادی سبق (LESSON) ہیں

۱۔ کامیابی اور ناکامی کا معیار

سب سے نمایاں اور سب سے اہم حقیقت جو بالکل ظاہر و باہر ہے اور گویا اس جام حقیقت نما سے خود بخود چھلکی پڑ رہی ہے یہ ہے کہ اس سورت میں انسان کی اصل کامیابی اور ناکامی اور اس کے حقیقی نفع و نقصان کا معیار پیش کیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو آپ سب اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں کہ ہر انسان اپنے سامنے کامیابی اور ناکامی اور نفع و نقصان کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور رکھتا ہے اور اس کی ساری عملی جد و جہد اور دنیا کی زندگی میں اس کی تمام محنت و مشقت کا رخ اس معیار ہی سے متعین ہوتا ہے جو لوگ عقلی اعتبار سے بلوغ اور پختگی کو پہنچ چکے ہیں۔ ان میں سے تو شاذ ہی کوئی ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی متعین نصب العین (GOAL) اور مطمح نظر (IDEAL) نہ ہو۔ عموماً چھوٹے بچوں خصوصاً ان میں سے جو زیادہ ذہین ہوتے ہیں ان کے سامنے بھی کوئی نہ کوئی معیارِ مطلوب ضرور ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ اپنی محنت اور جد و جہد کو مرتکز (CENTRALISE) کر دیتے ہیں۔

ہم اگر ذرا وقت نظر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ بلکہ خود اپنے دل و دماغ میں جھانک کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اس دور میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار یا تو روپیہ پیسہ، مال و دولت اور زمین و جائداد ہے یا حیثیت، وجاہت، اقتدار اور دنیوی دبدبہ و جاہ و جلال اور یا عزت و شہرت

اور نام ونمود۔ چنانچہ الّا ماشاء اللہ سب لوگ ان چیزوں کی طلب میں لگے ہوئے ہیں اور انہی کے لیے انہوں نے اپنی ساری سعی وجہد اور محنت ومشقت کو صرف کر دیا ہے۔ اکثر طلبہ کے ذہنوں میں بھی یا تو کسی ایسے فن کی تحصیل ہے جس سے خوب دولت کمائی جاسکے یا پھر کسی حیثیت و وجاہت والی پوزیشن کا حصول ہے اور ان چیزوں کو حاصل کر لینا ہی ان کے نزدیک کامیابی ہے۔ اور نہ کر سکنا ناکامی۔

سورۂ والعصر سے جو عظیم حقیقت سامنے آتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کی کامیابی کا معیار نہ روپیہ پیسہ ہے، نہ حیثیت و وجاہت، نہ جاہ وجلال ہے نہ نام و نمود بلکہ اس کی اوّلین شرط ہے ایمان، دوسری شرط ہے عمل صالح۔ تیسری شرط ہے تواصی بالحق اور چوتھی شرط ہے تواصی بالصبر ——— گویا ہر وہ انسان جس میں یہ چار چیزیں موجود نہ ہوں ایک ناکام، نامراد اور خائب وخاسر انسان ہے چاہے وہ لکھ پتی ہی نہیں کروڑ پتی ہو بلکہ قارون کی سی دولت اسے حاصل ہو جائے اور چاہے کتنا ہی صاحب حیثیت و وجاہت کیوں نہ ہو اور فرعون اور نمرود کی سی بادشاہی ہی کیوں نہ حاصل کر لے۔ اور اس کے برعکس (CONVERSELY) ہر وہ شخص کامیاب اور بامراد اور فائز المرام ہے جس میں یہ چاروں چیزیں موجود ہوں چاہے اس کے پاس مال و دولت دنیوی سرے سے موجود نہ ہوں بلکہ اسے فاقوں سے سابقہ ہو۔ اور چاہے وہ جائداد اور متاعِ اسبابِ دنیوی سے کتنا ہی تہی دست کیوں نہ ہو یہاں تک کہ اس کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہ ہو اور چاہے وہ دنیا میں کتنا ہی غیر معروف اور گمنام کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ کوئی اسے پوچھتا تک نہ ہو۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس حقیقت کو سرسری طور پر مان لینا جس قدر آسان ہے اس پر دل کا ٹھک جانا اسی قدر مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کے ظواہر سے لازماً متاثر ہوتے ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں آرام اور آسائش اور یہاں پر عزت وشہرت، روپے پیسے اور اور اسباب و وسائل ہی سے وابستہ ہے تو ہم بے اختیار ان چیزوں کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز اور کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ گویا اس دنیا کی زندگی میں ہمارے رویّے اور طرزِ عمل کی درستی کا تمام تر انحصار اسی بات پر ہے کہ ہمارا معیارِ کامیابی و ناکامی اور نفع و نقصان بدل جائے۔ چنانچہ یہی اس مبارک سورت کا اصل سبق ——— (LESSON) ہے۔

آپ خود غور کریں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر وہ سادہ سی حقیقت جو اس عظیم سورت میں بیان ہوئی ہے ہمارے ذہن نشین ہو جائے اور وہ سادہ سا جملہ جس پر یہ سورت مشتمل ہے ہماری لوحِ قلب

پرکندہ ہو جائے تو ہمارے نقطۂ نظر میں کیسا عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا۔ ہماری اقدار (VALUES) کتنی بدل جائیں گی۔ اور عملی زندگی میں ہمارا رویّہ (ATTITUDE) کس قدر تبدیل ہو جائے گا۔ جو چیز پہلے اہم ترین نظر آتی تھی اب انتہائی حقیر نظر آئے گی۔ اور جو پہلے بالکل غیر وقیع نظر آتی تھی اب انتہائی اہم محسوس ہو گی۔

واقعہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا اس کی تہہ میں نقطۂ نظر کی یہی تبدیلی کارفرما تھی اور نقطۂ نظر کی اسی تبدیلی کا کرشمہ تھا کہ انہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا بالکل حقیر نظر آتے تھے حتیٰ کہ انہیں زندگی کی نسبت موت زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔

الغرض — اس سورۂ مبارکہ کا اصل سبق یہی ہے اور ہم میں سے ہر شخص کو چاہیئے کہ اس کا خوب 'مراقبہ' کرے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین بھی کرے اور جاگزینِ قلب بھی!

۲۔ نجات کی کم از کم شرائط — اور اس کے ناگزیر لوازم

دوسرا بنیادی نتیجہ جو اس جملے کی ترکیب (CONSTRUCTION) سے خود بخود حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ اس سورت میں نجات کی کم از کم شرائط بیان ہو رہی ہیں اور اس کے ناگزیر لوازم کا ذکر ہے نہ کہ کامیابی کی بلند ترین منازل یا فوز و فلاح کے اعلیٰ مراتب کا۔ گویا کہ یہ نجات (SALVATION) کے کم از کم (MINIMUM) تقاضوں کا بیان ہے اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف آخری درجے میں پاس ہونے کی شرح — (MERE PASS PERCENTAGE) کا بیان ہو رہا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا نتیجہ بھی عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے اور اسی کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں شدید اخلاقی و عملی انحطاط پیدا ہوا۔ اس لیے کہ فطری طور پر انسان میں محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مادّہ کامیابی کے کم از کم معیار کی نسبت اور تناسب ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو خصوصاً دینی معاملات میں اعلیٰ مراتب اور بلند مقامات کے لیے کوشاں ہوں۔ اس کے برعکس عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح ہمّت کر کے نجات کے کم از کم لوازم کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں نجات کے کم از کم تقاضوں

کو نہایت سادہ الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمّت اور وسعت کے مطابق ان کو پورا کرنے پر کمربستہ ہو سکیں۔

۳۔ چاروں شرطیں لازمی ہیں

تیسرا نتیجہ جو اسی دوسرے نتیجے کی فرع (COROLLORY) ہے، یہ ہے کہ نجات کے لیے ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر چاروں لازم ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اس میں کوئی حرف بھی ضرورت سے زائد اور محض ردیف و قافیہ کی ضرورت کے تحت یا غیر ضروری مبالغہ آمیزی کے لیے نہیں ہے اور جب یہاں خسارے اور ناکامی سے نجات کی شرائط کے ضمن میں چار چیزوں کا بیان ہوا ہے تو یقیناً وہ چاروں ہی چیزیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے تو انسان کی نجات کی ذمہ داری قرآن حکیم پر نہیں رہے گی۔ بالکل ایسے جیسے اگر کوئی ماہر معالج کسی مریض کو چار ادویات پر مشتمل نسخہ لکھ کر دے اور مریض اپنی مرضی سے اس میں سے کسی ایک دوا کو کم کر دے تو اب اس نسخے کی ذمہ داری اس معالج پر نہیں ہوگی بلکہ خود اس مریض پر ہوگی۔

اس حقیقت پر زور دینا اس لئے ضروری ہے کہ ہم مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ غلط بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے۔ گویا نجات کے لیے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی کچھ عمل بھی کرلے تو یہ اضافی نیکی ہے۔ اور اس سے اس کے درجات بلند ہو جائیں گے ورنہ محض نجات کے لیے عمل ضروری نہیں ہے۔ بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی آپ کو ملے گی جو ایمان کے ساتھ تھوڑے بہت عمل کو بھی کسی درجے میں نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ اور یہ تھوڑی تعداد بھی تواصی بالحق اور حق کی دعوت و اشاعت کو تو ہرگز ہر شخص کے لیے لازم نہیں سمجھتی۔ اور یہ خیال بالکل یقینی سا گردانا جاتا ہے کہ حق کی تبلیغ و تلقین تو بس ایک مخصوص گروہ ہی کا کام ہے۔ باقی لوگوں کے لیے نہ صرف یہ کہ دعوت و تبلیغ لازمی نہیں ہے بلکہ مناسب بھی نہیں۔ پھر اس خاص گروہ نے بھی بجائے کامل اور مکمل حق کی تبلیغ سے ابتلا و آزمائش کو دعوت دینے کے عزیمت کی راہ کو چھوڑ کر زیادہ تر رخصتوں پر اپنے عمل کا دارومدار رکھ دیا ہے ——— اور اس طرح پوری اُمّت پر بے عملی، جمود، تعطّل، اور عمل سے گریز و فرار کی ذہنیّت کا تسلّط ہو گیا ہے اور اس صورت حال میں کوئی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ نجات کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ناگزیر ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حق کا اقرار

و اعلان اور اس کی دعوت و شہادت بھی لازمی ہے اور اس راہ میں جو مصیبت یا تکلیف آئے اس پر ثابت قدم رہنا بھی ——— چنانچہ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جو اس انتہائی مختصر مگر نہایت جامع سورت میں بیان ہوئی۔

ان چاروں چیزوں کے مابین جو عقلی اور منطقی ربط ہے اسے بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کسی انسان کا صاحبِ سیرت و کردار قرار پانا اس پر منحصر ہے کہ وہ ہر معاملے میں اولاً یہ دیکھے کہ صحیح بات کیا ہے۔ پھر جس بات کی صحت پر اس کے دل و دماغ گواہی دیں اس کو عملاً اختیار کرے۔ اور نہ صرف خود اختیار کرے بلکہ اس کا اقرار و اعتراف اور اعلان عام بھی کرے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کو ماننے اور قبول کرنے کی دعوت دے اور پھر اگر اس راہ میں کوئی دقت پیش آئے یا ایثار اور قربانی اور سرفروشی و جانفشانی کا مرحلہ آجائے تو پامردی اور ثبات و استقلال کا ثبوت دے اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ جائے۔ کسی شریف اور صاحبِ کردار انسان کے لیے ان مراحل میں سے کسی میں بھی کوئی دوسری روش اختیار کرنا ممکن نہیں۔ بصورت دیگر وہ ایک بودا، تھڑولا اور کمزور سیرت و کردار کا حامل انسان قرار پائے گا نہ کہ ایک شریف اور صاحبِ کردار انسان۔ چنانچہ یہی عقلی ربط اور منطقی ترتیب (LOGICAL SEQUENCE) ہے ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر میں۔ اور کسی بھی صاحبِ کردار انسان کے لئے ان میں سے کسی ایک سے بھی کنّی کترانا ممکن نہیں ہے۔

۴۔ زورِ کلام ——— اور انتہائی تاکید و توثیق

چوتھا اور آخری نتیجہ جو اسی مختصر سی سورت کی عبارت کے تجزیئے سے حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ متذکرہ بالا تینوں نتائج سرسری نہیں بلکہ انتہائی موکّد اور موثّق ہیں اور ان میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ اوّل تو ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اور اللہ کی فرمائی ہوئی بات اپنی صداقت اور حقانیت پر خود آپ ہی دلیل کامل ہے۔ "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا" اور "اپنے قول میں خدا سے زیادہ سچّا اور کون ہو سکتا ہے؟" ——— لیکن یہاں اسی پر اکتفا نہیں ہے بلکہ خود خدا نے بھی ان حقائق پر قسم کھائی ہے۔ اور اس طرح یہ کلام انتہائی موکّد ہو گیا ہے اور اس میں جو حقائق مضمر ہیں اور انسان کے لئے جو سبق پنہاں ہیں وہ سب انتہائی یقینی اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے منزّہ و مبرّا ہیں! یعنی یہ کہ یقیناً نوعِ انسانی بحیثیت مجموعی گھاٹے اور خسارے سے دوچار ہونے والی اور ہلاکت و تباہی کا نوالہ بننے والی ہے۔ ماسوائے ان افرادِ نوعِ انسانی کے جو ایمان، عملِ صالح

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، چاروں لوازم کو پورا کریں اور نجات کی اس کسوٹی پر بحیثیت مجموعی پورے اتریں۔

الغرض۔ یہ ہیں وہ چار بنیادی نتائج جو اس سورۂ مبارکہ پر بحیثیت مجموعی ادنیٰ تامّل اور سرسری سے غور و فکر سے حاصل ہوتے ہیں۔ گویا یہ ہے "تـذکـر" کی سطح پر سورۂ والعصر کا اصل ماحصل!

(۳)

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اس سورۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ کو قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور بطور خود دیکھیں کہ اس سورۂ عظیمہ کی ظاہری سلاست کے پردوں میں کیسے کیسے عظیم حقائق مضمر ہیں اور کیسی کیسی اعلیٰ حکمتیں اور دانائیاں پنہاں ہیں اور اس طرح غالبؔ مرحوم کے اس شعر سے بھی لطف اندوز ہوں کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اور اس کے اس مصرعے کی بھی داد دیں کہ ؏

زیرِ ہر ہر لفظِ غالبؔ چیدہ ام میخانۂ

اس لیے کہ غالبؔ نے اپنے کلام کے بارے میں تو یہ باتیں بس شاعرانہ تعلّی ہی میں کہہ دی ہیں لیکن قرآن حکیم واقعۃً ان کا مصداق کامل ہے۔

"والعصر" کا حقیقی مفہوم

سب سے پہلے لفظ 'والعصر' کو لیجئے جس کا سادہ سادہ ساترجمہ ہم "زمانے کی قسم ہے!" کر آئے ہیں۔

'عصر' کا اصل مفہوم صرف زمانہ نہیں بلکہ "تیزی سے گذرنے والا زمانہ" ہے۔ عربی میں عصر اور دھر کے دو الفاظ بہت جامع ہیں۔ اور ان دونوں میں صرف زمان (TIME) نہیں بلکہ زمان و مکان کے مرکّب (TIME AND SPACE COMPLEX) کی جانب اشارہ ہے اور حُسنِ اتفاق سے قرآن مجید میں عصر اور دہر دونوں ہی کے نام سے سورتیں موجود ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دہر میں مرکّبِ زمان و مکان کی وسعت کا لحاظ ہے یا جدید فلسفے کی اصطلاح میں یوں کہیں کہ زمانِ مطلق —— (ABSOLUTE TIME - OR PURE DURATION) مراد ہے۔ جبکہ لفظ عصر میں زمانہ کے

مَرُور اور اس کی تیزروی کی جانب اشارہ ہے۔ گویا فلسفیانہ اصطلاح میں زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل ـــ (SERIAL TIME) مراد ہے۔

'والعصر' میں حرف واؤ حرفِ جار ہے اور اس کا مفاد قسم کا ہوتا ہے۔ اور قسم سے اصل مراد شہادت اور گواہی ہے۔

گویا لفظ 'والعصر' کا حقیقی مفہوم یہ ہوا کہ "تیزی سے گزرنے والا زمانہ شاہد ہے اور گواہی دے رہا ہے!"

خُسران کے وسیع تر معنی

اسی طرح دوسری آیت کا سادہ ترجمہ بھی ہم نے یہ کیا تھا کہ "پوری نوعِ انسانی گھاٹے اور خسارے میں ہے!" لیکن اس سے بھی اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا اس لئے کہ 'خسران' قرآنی اصطلاح میں صرف دو چار ہزار یا دو چار لاکھ کے گھاٹے کو نہیں بلکہ کامل تباہی اور بربادی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ کامیابی اور بامرادی کے لیے تو قرآن حکیم میں متعدد الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے فوز و فلاح اور رشد و سعادت لیکن ان سب کی کامل ضد (ANTONYM) کی حیثیت سے ایک ہی جامع لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے 'خسران'۔ گویا دوسری آیت کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ "پوری انسانی تباہی اور ہلاکت و بربادی سے دوچار ہونے والی ہے!"

اس عظیم آیت میں جو اہم حقیقت بیان ہوئی اور نوعِ انسانی کے جس المیے (HUMAN TRAGEDY) کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے اس کا صحیح فہم و ادراک دو مرحلوں (STAGES) میں ہو سکتا ہے:

ایک یہ کہ ہر انسان اس دنیا کی زندگی میں شدید قسم کی محنت اور مشقت سے دوچار ہے۔ اکثر لوگوں کو اپنی اور اپنے لواحقین (DEPENDANTS) کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے لیے صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر بھی بنیادی ضرورتیں (BASIC NECESSITIES) تک پوری نہیں ہوتیں چنانچہ انسانی آبادی کی ایک عظیم اکثریت غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ ایسی بنیادی چیزوں تک سے مناسب حد تک بہرہ اندوز نہیں۔ جو لوگ نسبتاً خوشحال ہیں انہیں بھی بہرحال محنت اور مشقت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

اس حد تک تو پھر بھی انسان زیادہ سے زیادہ ایک باربرداری کے جانور سے مشابہ ہے۔ لیکن اس کا مزید المیہ یہ ہے کہ اس میں احساسات بھی بے پناہ موجود ہیں، لہٰذا اسے ان مشقتوں پر مستزاد بے شمار

قسم کے صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد کی محبّت اسے رلاتی ہے تو کبھی اعزّہ و اقارب کے دکھ اسے بانٹنے پڑتے ہیں۔ کبھی یہ کسی عزیز کی بیماری کا رنج سہہ رہا ہوتا ہے تو کبھی کسی محبّ ومحبوب کی موت کا صدمہ یہ برداشت کرتا ہے۔ الغرض اس کے لیے صرف محنت ومشقت ہی ضروری نہیں بلکہ رنج والم بھی لازمی ہیں۔ بقول غالبؔ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ حیاتِ انسانی میں اسی درد اور دکھ اور رنج والم کے مشاہدے سے مہاتما گوتم بدھ اس درجہ دل برداشتہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے عین جوانی کے عالم میں نوجوان بیوی اور معصوم بیٹے کو سوتے ہوئے چھوڑ کر جنگل میں جا دھونی رمائی تھی۔

خوشحال اور دولت مند لوگوں کے بارے میں عوام کو اکثر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید انہیں کوئی دکھ نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے جس نوع کے نفسیاتی کرب (PSYCHIC AGONY) سے ان کی اکثریت دوچار ہوتی ہے اس کا تو اندازہ بھی عام آدمی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بے شمار قسم کے تضاداتِ ذہنی (CONFLICTS) اور مایوسیوں (FRUSTRATIONS) کا سامنا رہتا ہے اور اکثر و بیشتر امراضِ دماغی (MENTAL DISEASES) کا شکار اسی طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔

یہ دراصل انسانی المیے کا پہلا درجہ ہے اور اسی کا ذکر قرآن حکیم کے تیسویں پارے میں سورۃ بلد کی اس آیت میں نہایت فصاحت و بلاغت سے ہوا ہے کہ " لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۝" ہم نے انسان کو مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔

اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس کا المیہ دنیا کی زندگی ہی میں ختم نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اس کا اصل اور سخت تر مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ گویا بقول شاعر ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے!
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے!

انسانی ٹریجڈی کا نقطۂ عروج (CLIMAX) یہ ہے کہ دنیا کی ساری محنتیں اور مشقتیں جھیل کر اور ساری کلفتیں سہہ کر اچانک اسے اپنے خالق و مالک کے سامنے محاسبے کے لیے بھی پیش ہونا پڑے گا جہاں اسے اپنے زندگی بھر کے اعمال وافعال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہی نقشہ ہے جو قرآن مجید کی اس آیۂ کریمہ میں کھینچا گیا کہ یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا

فَمُلٰقِیۡہِ ٥ (سورۃ انشقاق) "اے انسان تجھے مشقتیں سہتے اور کھپتے کھپاتے بہر حال اپنے رب کی خدمت میں جاحاضر ہونا ہے!" ——— اور پھر اگر اس محاسبے میں اس کے خیالات و اعتقادات اور افعال و اعمال میں کجی کا پہلو غالب نکلا تو اسے ہمیشہ ہمیش کے لیے دردناک سزا اور اذیت بخش عذاب کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور یہی اصل خسران ہے (ذٰلِکَ ھُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ)
اور مختصراً یہ ہے "اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ" کا حقیقی مفہوم۔

پہلی دو آیتوں کا باہمی ربط

یہ تو واضح ہے کہ پہلی آیت ایک قسم پر مشتمل ہے اور دوسری جواب قسم پر یعنی دوسری آیت میں ایک حقیقت کا بیان ہے اور پہلی میں اس پہ زمانہ کی گواہی کی جانب اشارہ ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کے مابین منطقی ربط کیا ہے؟

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر یعنی زمانِ جاری یا زمانِ مسلسل ایک ایسی چادر کے مانند ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے۔ گویا زمانہ انسان کی تخلیقِ اوّلین سے لے کر نہ صرف انسان کی حیاتِ دنیوی اور اس کی پوری تاریخ بلکہ حیاتِ اُخروی اور اس کے جملہ مراحل کا چشم دید گواہ ہے۔

چنانچہ انسان کی محنت اور مشقت اور رنج و الم سے بھرپور زندگی بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، اور قوموں کے عروج و زوال کے تمام واقعات کا بھی وہ چشم دید گواہ ہے اور حیاتِ اخروی میں انسانی ٹریجڈی کا نقطۂ عروج بھی گویا اس کے بالکل سامنے موجود ہے۔ اس طرح "اِنَّ الانسانَ لفی خسرٍ" کا سب سے بڑا شاہد گویا زمانہ ہی ہے!

اس حقیقت، پہ ایک تنبیہ و انذار کا مزید رنگ ہے جو لفظ "والعصر" کے استعمال سے پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کی ہلاکت اور تباہی اور خسرانِ حقیقی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس پہ غفلت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ماحول اور اپنے فوری مسائل و معاملات میں الجھ کر گویا گمشدگی کی سی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے!
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

"والعصر" کا لفظ انسان کو جھنجھوڑ کر غفلت سے بیدار کرتا ہے کہ غافل انسان تیرا اصل سرمایہ وہ وقت ہے جو تیزی سے گزرا جا رہا ہے اور تیری اصل پونجی یہ مہلت عمر ہے جو سرعت سے ختم ہو رہی ہے

اور اگر تو نے اس میں اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کی یا بقول علامہ اقبال اپنی "خودی کو بلند" نہ کر لیا تو پھر ابدی ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا! گویا بقول شاعر ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی!

ایمان کا اصل مفہوم

اس خسرانِ عظیم اور تباہی و بربادی سے نجات کی شرطِ اوّل ایمان ہے۔

ایمان کا لفظ، امن سے بنا ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں کسی کو امن دینا اور سکون بخشنا۔ لیکن اصطلاحی معنی میں یہ 'ل' یا 'ب' کے صلوں (PREPOSITIONS) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے 'اٰمَنَ لَہٗ' یا 'اٰمَنَ بِہٖ'، اور اس صورت میں اس کے لفظی معنی تصدیق اور یقین و اعتماد کے بن جاتے ہیں۔

ایمان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ ہر وہ انسان جو عقل اور شعور کی پختگی کو پہنچ جائے لازماً یہ سوچتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ اور یہ کائنات کیا ہے اور اس کی ابتداء و انتہا کیا ہے۔ اور خود میرے سفرِ زندگی کی آخری منزل کونسی ہے۔ جن لوگوں نے فلسفہ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ کے دوران میں تمام سوچنے اور سمجھنے والے لوگ انہی سوالات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں اور انہی کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر انسان بالکل اندھیرے میں ہے کہ نہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہے نہ کائنات کی حقیقت پر مطلع۔ اور نہ اپنے آغاز و انجام کی خبر اسے حاصل ہے نہ کائنات کی ابتداء و انتہا کا علم۔ گویا بقول شاعر ؎

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم!

اب ظاہر ہے کہ ان سوالات کا حتمی اور یقینی جواب ہم اپنے حواس سے ہرگز معلوم نہیں کر سکتے۔ ہمارا اس عالمِ طبعی (PHYSICAL WORLD) کے بارے میں علم اگرچہ بہت ترقی کر چکا ہے لیکن ابھی تک تو ہم اس کی وسعتوں کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں کر پائے کجا یہ کہ اس کی ابتداء اور انتہا کا علم ہمیں حاصل ہو۔ اسی طرح اس سوال کا جواب بھی کہ آیا اس دنیا میں پیدائش سے قبل بھی ہماری کوئی حقیقت تھی یا نہیں اور موت کے بعد بھی ہمارا کوئی وجود برقرار رہے گا یا نہیں۔ حواس کے

ذریعے ممکن نہیں اس لئے ہم اپنے حواس کے ذریعے نہ پیدائش سے پہلے کی دنیا میں جھانک سکتے ہیں اور نہ موت کے بعد کے عالم میں؛ غرض علم حقیقی کے بارے میں انسان کی مجبوری اور بے بسی کا عالم یہ ہے:

اس پس منظر میں غور کیجئے کہ تاریخ انسانی کے دوران مسلسل بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہمارے پاس ایک خاص ذریعہ علم (وحی) ہے جس کی بنا پر ہم حتمی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ یہ کائنات نہ ہمیشہ سے تھی نہ ہمیشہ رہے گی بلکہ اسے ایک خالق نے پیدا کیا ہے جو تمام صفاتِ کمال سے بدرجۂ تمام و کمال متصف ہے اور اپنی ذات و صفات میں تنہا و یکتا ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہاری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی نہیں بلکہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ تمہاری اصل اور دائمی زندگی ہوگی۔ اور اس زندگی میں تمہارے ساتھ معاملہ اور سلوک اس زندگی کے خیالات اور عقائد اور افعال و اعمال کی بنیاد پر ہوگا اور اسی خالق و مالک نے ہمیں اس پر مامور فرمایا ہے کہ ہم تمہیں ان حقائق سے بھی آگاہ کر دیں اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتا دیں تاکہ تم اس اُخروی زندگی میں خسران سے بچ سکو اور فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکو۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان حضرات ہی کو ہم انبیاء اور رُسل کے نام سے جانتے ہیں اور ان ہی کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔ جس کے دو پہلو ہیں ایک زبانی اقرار اور دوسرے قلبی یقین۔ یعنی زبان سے گواہی دینا کہ ہم رسولوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کی جملہ صفات کو بھی اور بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب اور جزا و سزا کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور جنت و دوزخ کو بھی، اور دل میں ان تمام باتوں پر پختہ یقین رکھنا ایمان ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ایمان، کائنات اور انسان کے بارے میں علمِ حقیقی کا نام ہے۔ اور اس کے دو نتیجے لازمی ہیں:

ایک یہ کہ انسان کا اضطراب رفع ہو جائے اور اسے سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے اور کائنات اور خود اپنی حقیقت کا علم حاصل کرنے کی جو پیاس اس کی فطرت میں تھی اسے تسکین حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ داخلی امن ہی ایمان کا اصل حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اصطلاح امن کے مادے سے اخذ کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ چونکہ بقول سقراط "علم نیکی ہے اور جہالت بدی"۔ لہٰذا اس علمِ حقیقی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ عمل بھی درست ہو جائے اور انسان بہترین اخلاق سے مزین ہو جائے اور گھٹیا

اعمال و افعال کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ دوسری بات نہایت اہم ہے اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور ایمان اور عمل صالح باہم لازم و ملزوم ہیں۔

آپ خود غور فرمائیں کہ ایک شخص تو ایسا ہے کہ جس کے نزدیک یہ کائنات ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہے۔ اور اس کا پورا نظام خود بخود چل رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو اس کے برعکس یہ مانتا ہے کہ ایک علیم و خبیر ہستی اور عزیز و حکیم ذات نے ہی اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اسی ... کے چلائے اس کا نظام چل رہا ہے۔ تو کیا ان دونوں کا عملی رویہ ایک ہی ہو سکتا ہے اور کیا ان کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق واقع نہیں ہو جائے گا، اسی طرح ایک شخص وہ ہے جس کے نزدیک زندگی بس یہی زندگی ہے جو ہم اس عالم میں بسر کر رہے ہیں اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ کوئی حساب کتاب نہیں۔ کوئی پوچھ گچھ نہیں اور کوئی جزا و سزا نہیں اور دوسرا شخص یقین رکھتا ہے کہ اصل کتابِ زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی تو بس ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے اور مرنے کے بعد ہر انسان کو اپنے ہر ہر عمل ہی نہیں ہر ہر قول بلکہ ہر ہر خیال تک کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ تو کیا ان دونوں کے عملی رویے میں مشرق و مغرب کا بُعد پیدا ہونا لازم نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ پہلے انسان کا فلسفہ ہی بن جائے گا کہ ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

اور اس عیش کوشی میں نہ اسے صحیح و غلط کی تمیز رہے گی نہ جائز و ناجائز کی اور نہ حلال و حرام کی۔ اس کے برعکس دوسرا شخص زندگی میں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھائے گا۔ اور ایک احساسِ ذمہ داری ہر دم اس کے سر پر مسلط رہے گا۔ گویا ایمان کے نتیجے میں انسان کی شخصیت میں ایک انقلاب (TRANSFORMATION) لازمی ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں جو یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ایمان جدا ہے اور عمل جُدا تو یہ صرف قانونی درجے میں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں کسی شخص کا مسلمان سمجھا جانا صرف اس کے اقرار باللسان پر مبنی ہے اور اس میں انسان کا عمل زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن وہ حقیقی ایمان جو عبارت ہے یقینِ قلبی سے لازماً عمل میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر عمل میں تبدیلی نہ پیدا ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقتاً ایمان موجود نہیں ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں واضح کیا ہے۔

چنانچہ آپ کا ایک قول مبارک ہے کہ " لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ " اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کا وصف نہیں اور جو امانت (TRUST) کو ضائع (BETRAY) کرتا ہے۔ اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں! غور کریں کتنا پیارا ہے حضور کا اندازِ بیان اور کتنی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے وہ بات جو آپ نے فرمائی

اسی طرح ایک موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار قسم کھا کر فرمایا " وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ " خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ اس پر صحابہؓ نے سوال کیا " مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! " حضورؐ کس کی بابت ارشاد فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ " اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ "۔ یعنی وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ چین میں نہ ہو! غور فرمائیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر تاکید کے ساتھ ایمان کی نفیٔ کلّی کا اعلان فرما رہے ہیں اور وہ بھی کسی گناہ کبیرہ پر نہیں، شرک، قتل ناحق، زنا یا چوری ڈاکے پر نہیں بلکہ صرف ایک ایسی بات پر جسے ہم زیادہ سے زیادہ بد اخلاقی پر محمول کرتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس خیال کے لیے کوئی گنجائش ہے کہ ایمان اور عمل دو علیحدہ چیزیں ہیں اور باہم لازم و ملزوم نہیں! اسی غلط فہمی کی نفی کے لیے قرآن مجید کا مستقل اسلوب یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا ہمیشہ ساتھ ساتھ ذکر آتا ہے اور ایمان کے بعد اس کے لازمی نتیجے کے طور پر عمل صالح کا ذکر ضرور کر دیا جاتا ہے۔

اچھی طرح سمجھ لیں کہ جب تک ایمان صرف " اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ " کے درجے میں رہتا ہے یعنی صرف "قول" تک محدود ہوتا ہے۔ عمل اس کے خلاف ہو سکتا ہے اس لیے کہ قول و فعل کا تضاد تو اس دنیا کی ایک عام چیز ہے۔ لیکن جب یہی ایمان " تصدیق بالقلب " کے درجے کو پہنچ جاتا ہے یعنی یقین بن کر دل میں اتر جاتا ہے تو پھر عمل کا بدل جانا لازمی ہے۔ اس لیے کہ انسان کا عملی رویہ اس کے یقین ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں یقین ہے کہ آگ جلا دیتی ہے تو ہم کبھی آگ میں ایک انگلی تک ڈالنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ یقین تو دور کی بات ہے انسان کا عمل تو گمان سے بھی متاثر ہو جاتا ہے جیسے ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن ایک گمان سا ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ سانپ زہریلا ہو تو اس گمان کے نتیجے میں بھی ہم لازماً اس سے بچتے ہیں۔ تو پھر اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ خدا ہے، اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے۔ میری ہر ہر حرکت بلکہ میری زبان سے نکلنے والا ہر ہر لفظ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر میرے دل کا ہر ہر ارادہ اس کے علم میں ہے۔ اور مجھے مر کر لازماً اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور اپنے پورے کارنامہ

زندگی کی جوابدہی کرنی ہے۔ پھر نہ اس کی سزا اور پکڑ سے کہیں بھاگ کر بچ نکلنے کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی کسی سفارش یا کچھ دے دلا کر چھوٹ جانے کی کوئی صورت تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ گناہ اور معصیت کی زندگی بسر کرتا رہے۔ یہی رمز ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک میں بیان ہوا کہ " لا یزنی زانٍ حِینَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُومِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِینَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُومِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِینَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُومِنٌ " یعنی کوئی بدکار حالتِ ایمان میں بدکاری نہیں کرتا اور نہ کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری کرتا ہے اور نہ کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نوشی کرتا ہے۔ بلکہ ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔

گویا ایمان اور عملِ صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ بلکہ صحیح اور درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمانِ حقیقی کا لازمی جزو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ والعصر میں ایمان کے بعد نجات کی دوسری شرط کے طور پر عمل صالح کا ذکر کر دیا گیا۔

عمل صالح کا اصل مفہوم

'عمل صالح' کا عام ترجمہ اچھے اور نیک اعمال سے کیا جاتا ہے لیکن خود اس لفظ کی گہرائی میں اتریے تو مزید حقائق پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف تو اس کے باوجود کہ عمل اور فعل دو نہایت قریب المفہوم الفاظ ہیں ان کے معنی میں ایک باریک سا فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ فعل کسی بھی کام کو کہہ دیں گے لیکن عمل کا اطلاق عام طور پر محنت طلب اور مشقت بخش کام پر ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف صالح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت موجود ہو۔ اب ان دونوں کو جوڑیئے تو معلوم ہو گا کہ اس اصطلاح کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنا وہ اصل مقام حاصل کرنے کے لیے جس پر اس کی بالقوّہ (POTENTIALLY) تخلیق ہوئی ہے ایک محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے اور ایک چڑھائی چڑھنی لازم ہے۔ جس کا جامع عنوان عمل صالح ہے۔ گویا یہ وہی بات ہوئی جو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کی کہ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

سورۂ والتین بہت سے اعتبارات سے سورہ والعصر سے بہت مشابہ ہے۔ چنانچہ اس میں اس

حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ " لَقَدْ خَلَقْنَا الانسان فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ " یعنی انسان کی تخلیق اصلاً تو نہایت اعلیٰ مقام پر ہوئی تھی اور اسے جنوں ہی نہیں فرشتوں پر بھی فضیلت عطا کر کے خلافت و نیابتِ الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا تھا لیکن پھر عملاً اسے عالمِ آب و گل میں مقید اور نفس امّارہ کے پھندوں میں گرفتار کر کے گویا نیچے والوں میں سب سے نچلے مقام پر ڈال دیا گیا۔ اب اپنے اصل مقام کی بازیافت کے لیے لازم ہے کہ وہ علم حقیقی بھی حاصل کرے یعنی ایمان کے نور سے اپنے باطن کو منوّر کرے اور عمل صحیح بھی اختیار کرے یعنی اعمالِ صالح سے اپنے ظاہر کو مزین کرے اور شریعت اور طریقت کی راہوں پر گامزن ہو! چنانچہ یہی اس کی نجات (SALVATION) کے ابتدائی لوازم ہیں۔

تواصی کے معنی

سورۂ والعصر کے آخری ٹکڑے میں دو بار جو لفظ " تواصو " آیا ہے اس کا مصدر ہے " تواصی " اور یہ وصیّت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تاکید اور اصرار کے ساتھ کسی بات کی تلقین و نصیحت۔ پھر یہ مصدر بابِ تفاعل سے ہے جس کے خواص میں ایک تو باہمی اشتراک ہے اور دوسرے شدّت و مبالغہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک تو یہ عمل تواصی پورے زور شور اور پوری قوت و شدت کے ساتھ مطلوب ہے اور دوسرے اس مرحلے پر ایک اجتماعیت کا قیام ناگزیر ہو جاتا ہے جو باہم ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کے اصول پر مبنی ہو۔

حق کے معنی

اسی طرح لفظ حق بھی معنی و مفہوم کے اعتبار سے بہت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو واقعی ہو (یعنی محض خیالی اور وہمی نہ ہو!) یا عقل کے نزدیک مسلّم ہو یا اخلاقاً واجب ہو یا بامقصد اور غرض و غایت کی حامل ہو (یعنی بے کار اور لایعنی و عبث نہ ہو!)

تو معلوم ہوا کہ تواصی بالحق کے معنی ہوں گے ہر اس بات کا اقرار و اعلان اور ہر اس چیز کی دعوت و تلقین جو واقعی اور حقیقی ہو یا عقلاً ثابت ہو یا اخلاقاً واجب ہو۔ گویا حق کے دائرے میں چھوٹی سے چھوٹی صداقت سے لے کر کائنات کے بڑے سے بڑے حقائق و حقوق سب داخل ہو گئے اور تواصی بالحق کے ذیل میں چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی نصیحتوں سے لے کر اس سب سے بڑے حق کا اعلان بھی شامل ہو گیا کہ

اس کائنات کا مالک حقیقی صرف اللہ ہے اور صرف اسی کو حق پہنچتا ہے کہ دنیا میں اسی کا حکم چلے اور اُسی کا قانون نافذ ہو۔ پھر یہ کہ اس 'حق' کا صرف اعتراف و اعلان ہی نہ ہو بلکہ اس کی عملی تنفیذ کے لئے جدوجہد کی جائے۔

اس طرح تواصی بالحق کی جامع اصطلاح میں وہ سب مفہوم شامل ہیں جو قرآن حکیم کی بہت سی اصطلاحوں میں مضمر ہیں جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی ہر نیکی اور بھلائی کی دعوت دینا اور اس کا حکم دینا اور ہر بدی اور برائی سے منع کرنا اور روکنا۔ یا تواصی بالمرحمہ یعنی لوگوں کو باہم ایک دوسرے پر شفقت اور نرمی کرنے کی تلقین و نصیحت یا دعوت الی اللہ یعنی لوگوں کو اپنے مالک حقیقی کی معرفت حاصل کرنے اور عبادت اختیار کرنے کی دعوت دینا یا جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد کرنا اور اس کے لیے اپنی جانیں کھپانا اور مال صرف کرنا۔

صبر کا مفہوم

اسی طرح صبر کا لفظ بھی بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے اور اس کا اصل حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے طے کردہ راستے پر گامزن رہے اور اس سے اسے نہ کوئی تکلیف یا مصیبت ہٹا سکے نہ لالچ و حرص۔ گویا اسے اپنی راہ سے نہ تو کسی قسم کے تشدد (PERSECUTION) سے ہٹایا جاسکے نہ کسی طرح کے طمع اور لالچ (TEMPTATION) سے! بلکہ وہ ہر صورت میں ثابت قدم رہے اور ثباتُ استقلال اور پامردی و بہادری کے ساتھ حق پر خود بھی قائم رہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا چلا جائے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر باہم لازم و ملزوم ہیں

جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کہ حق کی دعوت کو دنیا میں بالعموم گوارا نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی مزاحمت لازماً ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل حق کو لازماً تکالیف اور مصائب کا سامنا رہتا ہے۔ ہم سب کو اس کا تجربہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نصیحت بھی بسا اوقات لوگوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو کسی دوسرے کے پانچ روپے ادا کرتے ہوں اور وہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ بھلے آدمی اس کے پانچ روپے ادا کر دو تو اس کی تیوری

پر بل پڑ جائیں گے اور وہ آپ سے سخت طیش میں کہے گا کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟ - اسی پر قیاس کرلیں کہ اگر بڑے بڑے حقوق کی ادائیگی کی تلقین ہو تو کیسی کچھ ناگواری ـــــ (RESENTMEMNT) کا سامنا کرنا ہوگا اور کتنی مزاحمت و مخالفت سے سابقہ پیش آئے گا۔

اور یہی مقام اصل میں انسان کی سیرت و کردار کے امتحان کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق کی پہچان اور اس کی معرفت اتنی مشکل نہیں ہے جتنا اس کو خود بھی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینا اور پھر اس راہ میں ثابت قدم رہنا جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں استقامت کہتے ہیں۔ اس مرحلے پر آ کر معلوم ہوتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور آیا سیرت و کردار نام کی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے یا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بڑے شدّ و مد (EMPHASIS) کے ساتھ اور نہایت تاکید و توثیق کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہوئی کہ اہلِ ایمان کو لازماً امتحان اور ابتلاء و آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کے دعوئے ایمان کی صداقت کو طرح طرح سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے اور صادق الایمان وہی قرار پاتے ہیں جو ان امتحانات میں ثابت قدم رہیں اور صبر و استقلال کا عملی ثبوت پیش کریں۔

ایمان، عمل صالح اور تواصی کا باہمی ربط

اب تک ہم نے سورۂ والعصر میں بیان شدہ نجات کی چار شرائط کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کر کے دیکھ لیا ہے کہ ایک طرف ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں اور دوسری طرف تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لزوم رکھتے ہیں۔ اب ان دونوں جوڑوں کے مابین جو لازمی رشتہ اور تعلق ہے، اسے بھی سمجھ لیں تو بات پوری ہو جائے گی۔

یہ فطرت کا عام اصول ہے کہ کوئی شئے نہ ماحول سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے نہ اسے متأثر کئے بغیر رہ سکتی ہے۔ برف میں جو ٹھنڈک ہے وہ اپنے ماحول میں لازماً سرایت کرے گی اور آگ کی حرارت اپنے ماحول کو لازماً گرم کر دے گی، یہی معاملہ اخلاقیات کے میدان میں ہے۔ اگر کسی انسان میں عمل صالح حقیقتاً پیدا ہو جائے تو وہ لازماً ماحول میں اثر و نفوذ کرے گا اور اس سے نیکی اور بھلائی لازماً پھیلے گی۔ گویا عمل صالح کا فطری نتیجہ تواصی بالحق ہے۔

انسانی اخلاقیات میں یہ اصول اور بھی شدّت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی ماحول خراب ہے تو اس کی خرابی لازماً افراد کی زندگیوں میں سرایت کرے گی اور اس سے بچنے کی ایک ہی راہ ممکن ہے

کہ ماحول کو تبدیل کر دیا جائے یا کم از کم اس کو تبدیل کرنے کی جدّوجہد مسلسل جاری رکھی جائے ۔ اس طرح اگر ماحول نہ بھی تبدیل ہو تو کم از کم وہ فرد "جارحیت بہترین دفاع ہے !" (BEST DEFENCE IS OFFENCE) کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنا دفاع ضرور کرے گا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مَنْ رَاٰی مِنکم مُنکرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ، فَاِن لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ، وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیمان "۔ تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے بزور بازو (نیکی سے) بدل دے ۔ پھر اگر اس کی قوّت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ضرور منع کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے ضرور مدافعت کرے یعنی دل میں ضرور بُرا جانے اور اس کو نہ روک سکنے پہ متأسّف ہو ۔ اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے ۔

پھر "تواصی بالحق" ، انسان کی شرافت کا بھی لازمی تقاضا ہے اس لیے کہ جو حق کسی انسان پر منکشف ہوا ہے اور جسے خود اس نے اختیار کیا ہے اس کی انسان دوستی کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بھی پیش کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسان اُس سے نفع اندوز ہوں اور اس کی برکتوں سے متمتّع ہو سکیں اسی لئے آنحضورؐ نے فرمایا کہ " لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ -یعنی تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں قرار پا سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے !

اور آخری درجے میں یہ انسان کی عزت اور حمیّت کا تقاضا بھی ہے کہ جس حق کو اس نے خود قبول کیا ہے اس کا پرچار کرے ۔ اس کا مبلّغ اور علمبردار بنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے تن من دھن سے جدوجہد کرے

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان ایک خاص طرز کو اختیار کرتا ہے اور ماحول کسی اور رنگ میں رنگا ہوا ہے تو نظری طور پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں ، ایک یہ کہ ع "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز !" کے مطابق خود بھی ماحول ہی کے رنگ میں رنگا جائے تاکہ دوئی ختم ہو جائے اور تصادم باقی نہ رہے اور دوسرے یہ کہ ع " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز !" کی روش اختیار کرے اور ماحول سے ٹکّر لے کر اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے ۔ اب ظاہر ہے کہ ایک شریف اور باوقار اور غیور اور باحمیّت انسان تو صرف ایک ہی راہ اختیار کر سکتا ہے اور وہ دوسری ہے نہ پہلی ۔ وہ اس کو تو گوارا کرے گا کہ "بازی اگرچہ پا نہ سکا ، سر تو کھو سکا !" کے مصداق اپنی جان دے دے لیکن اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ تن آسانی اور عافیت کوشی کی راہ پر چل کر حق سے غداری کا مرتکب ہو جائے ۔

الغرض - جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے نظر یہی آتا ہے کہ ایمان عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک جانب تو نجات کے ناگزیر لوازم ہیں اور دوسری جانب خود باہم لازم و ملزوم ہیں بلکہ ان چاروں پر علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے جو حقیقت منکشف ہوتی وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی وحدت کے ناقابلِ تقسیم پہلو ہیں۔ اور ایک ہی کُل کے اجزائے غیر منفک ہیں۔ گویا بقول اقبال "عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر" یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نقطۂ ایمان کی تفسیریں" ایمان اگر حقیقی ہو تو اس سے عمل صالح ضرور پیدا ہو گا اور عمل صالح اگر پختہ ہو جائے تو لازماً تواصی بالحق پر منتج ہو گا۔ اور تواصی بالحق اگر واقعی اور حقیقی ہے تو تواصی بالصبر کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کی عکسی صورت (CONVERSE PROPOSITION) بھی بالکل درست ہے یعنی یہ کہ اگر تواصی بالصبر کا مرحلہ نہیں پیش آیا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ دعوت پورے حق کی نہیں ہے بلکہ اس کے صرف کسی بے ضرر سے جزو کی ہے۔ اور اگر دعوت کا مرحلہ نہیں آتا تو یہ حتمی ثبوت ہے اس کا کہ انسان کا اپنا عمل صحیح اور پختہ نہیں ہے اور اگر عمل درست نہیں ہو رہا تو یہ یقینی ثبوت ہے اس کا کہ ایمان حقیقی ہی موجود نہیں۔

گویا سورۂ والعصر نجات کی جس شاہراہ کی طرف راہنمائی فرماتی ہے اور انسانی کامیابی کے لیے جس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتی ہے اس کے چار سنگ ہائے میل ہیں۔ پہلا ایمان، دوسرا عمل صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔

اسوۂ محمدیؐ

اور اس کی کامل اور مکمل مثال ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ جس میں یہ چاروں چیزیں اپنی بلند ترین شان کے ساتھ بتمام و کمال موجود ہیں۔

حضورؐ نے سب سے پہلے اپنی اور کائنات کی حقیقت پر مطلع ہونا چاہا اور جب بفحوائے "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى" جبریلِ امین نے حقائق کا کامل انکشاف کیا تو اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ والمومنون" ایمان لایا رسول اس پر جو نازل کیا گیا اس پر اس کے رب کی جانب سے اور ایمان لائے اہلِ ایمان۔

دوسری طرف آپ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا کامل نمونہ، اور خُلقِ عظیم کا شاہکار تھی جیسے کہ فرمایا گیا کہ "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" آپ یقیناً نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور اخلاق کے بلند ترین

باقی صلا پر

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ یونس

(۴)

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۷۱ - ۹۲

آگے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کسی قدر تفصیل کے ساتھ اور درمیان کے رسولوں کی اجمالاً مذکور ہوئی ہے۔ مقصود ان سرگزشتوں کے حوالہ سے انہی حقائق کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنا ہے جو اوپر عقل و فطرت کے دلائل سے مبرہن کئے گئے ہیں۔ ان میں پیغمبرؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے سرمایۂ تسکین اور آپ کے معاندین و مخالفین کے لیے پورا پورا درس عبرت موجود ہے۔ فرق اگر ہے تو نام و مقام اور زمانے کا ہے۔ اصل داستان اس قدر باہم گرمشابہ ہے کہ نام و مقام کے فرق کو نظر انداز کر دیجئے تو سرے سے کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے،

آیات ۷۱ تا ۹۲

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ
عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا
اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا
اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ
وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُنْذَرِيْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ

نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۷۴ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى
وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا
لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ط
اَسِحْرٌ هٰذَا ط وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا
عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ط وَمَا
نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹
فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰
فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ط اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ط
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ
قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ط
وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ج وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۸۳
وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا
اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝۸۴ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۵ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ
مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۶ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ ...
بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ط وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۷ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ
زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ج
رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۸۸ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا
فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹ وَجٰوَزْنَا
بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّ
عَدْوًا ط حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ لا قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ آٰلْئٰنَ

وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٩١﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ
لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا
لَغَافِلُونَ ﴿٩٢﴾ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم
مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ
يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

اور ان کو نوحؑ کی سرگزشت پڑھ کر سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم پر تمہارے اندر میرا رہنا اور اللہ کی آیات کی یاد دہانی کرنا گراں ہو گیا ہے تو میں نے بس اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنی رائے مجتمع کر لو اور اپنے شرکاء کو بھی بلا لو پھر تمہارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے اور میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے میرا اجر تو بس اللہ ہی پر ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔ تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو دیکھو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو ہوشیار کیا جا چکا تھا۔ ۷۱-۷۳

پھر ہم نے اس کے بعد رسول بھیجے ان کی اپنی قوموں کی طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حدود سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتے ہیں۔ ۷۴

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تو انہوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو سحر کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس آ چکا ہے۔ بھلا، یہ سحر ہے؟ اور ساحر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس طریقہ سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور ملک میں سیادت تم دونوں کو حاصل ہو جائے؟ اور ہم تو تم دونوں کی بات کبھی ماننے والے نہیں۔ اور فرعون نے حکم دیا کہ میرے پاس سارے ماہر جادوگروں کو حاضر کرو۔ تو جب جادوگر آئے موسیٰ نے ان سے کہا جو کچھ تمہیں پیش کرنا ہے اس کو پیش

کرو تو جب انہوں نے پیش کیا موسیٰ نے کہا جو کچھ تم لائے ہو، یہ جادو ہے ۔ بے شک اللہ اس کو نیست کر دے گا، اللہ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا اور اللہ مجرموں کے علی الرغم اپنے کلمات سے حق کا بول بالا کرتا ہے ۔ تو موسیٰ کی بات نہ مانی مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ڈرتے ہوئے فرعون اور اپنے بڑوں سے کہ مبادا وہ ان کو کسی فتنہ میں ڈال دیں ۔ بے شک فرعون ملک میں نہایت سرکش اور حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا ۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پہ ایمان لائے تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر چکے ہو۔ وہ بولے کہ ہم نے اللہ پہ بھروسہ کیا اے ہمارے رب ہمیں ظالموں کے ظلم کا آماجگاہ نہ بنا ۔ اور ہمیں اپنے فضل سے کافروں کے پنجۂ ستم سے چھڑا ۔ ۷۵-۸۶

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو ۔ اور موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے اعیان کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور مال و اسباب سے بہرہ مند کیا، اے ہمارے رب کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بے راہ کریں، اے ہمارے رب ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو بند کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو ۔ فرمایا تمہاری دعا قبول ہوئی تو تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کیجیو جو علم نہیں رکھتے ۔ ۸۷-۸۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے فوجیوں نے سرکشی اور زیادتی سے ۔ یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے کے لپیٹ میں آ گیا بولا کہ میں ایمان لایا کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں بنتا ہوں ۔ کیا اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے ۔ پس آج ہم تیرے جسم کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی بنے اور بے شک بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں ۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانا دیا اور ان کو اچھا رزق بخشا اور انہوں نے نہیں اختلاف برپا کیا مگر اس وقت جبکہ ان کے پاس علم آ گیا، تیرا رب ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں، قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا ۔ ۹۰-۹۳

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

'واتل علیھم نبأ نوح اذ قال لقومہ یٰقوم ان کان کبر علیکم مقامی وتذکیری باٰیٰت اللہ فعلی اللہ توکلت فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا الی ولا تنظرون۔ ۷۱

سب سے قدیم سرگزشت

پچھلی قوموں میں سے سب سے قدیم قوم، جس کی بربادی کی روایات عربوں میں مشہور تھیں، وہ نوحؑ کی قوم تھی۔ اس وجہ سے قرآن میں حسب تاریخی ترتیب سے قوموں کی سرگزشت بیان ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی قوم کا ذکر آتا ہے۔ اعراف آیات ۶۰ - ۶۴ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے محل وقوع اور اس کے تخمینی زمانہ کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ 'نبأ' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ مقصود نوحؑ اور قوم نوح کی زندگی کے کسی اہم موڑ اور کسی فیصلہ کن واقعہ کی سرگزشت سنانا ہے، مؤرخوں کی طرز کی مجرد داستان سرائی پیش نظر نہیں ہے۔

'ان کان کبر علیکم مقامی وتذکیری باٰیٰت اللہ' 'مقام' سے مراد اپنی قوم کے اندر وہ طویل قیام ہے جو حضرت نوحؑ کو حاصل ہوا۔ عنکبوت آیت ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے اندر ایک مدت دراز تک تبلیغ و دعوت میں سرگرم رہے یہاں تک کہ ان کے معاندین و مخالفین ان کی دعوت سے، جیسا کہ ہود آیت ۳۲ سے واضح ہو رہا ہے، بالکل تنگ آ گئے۔ اسی مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے یہ بات فرمائی ہے اور یہ درحقیقت تمہید ہے اس چیلنج کی جو آگے آ رہا ہے۔

حضرت نوحؑ کا چیلنج

'فاجمعوا امرکم .... الاٰیۃ' 'امر' سے مراد رائے اور فیصلہ ہے۔ یعنی تم میرے باب میں اجتماعی طور پر ایک قطعی فیصلہ کر لو اور اپنے ان معبودوں کو بھی اس فیصلہ میں شریک کر لو جن کو تم خدا کی خدائی میں شریک گردانتے ہو۔ 'ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ' 'غمہ' کسی ڈھانک لینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن محاورۂ کلام میں جب کہیں گے 'ھو فی غمۃ' تو اس کے معنی ہوں گے، وہ حیرانی اور تردد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا قطعی فیصلہ کر لو کہ اس میں کوئی تردد و تذبذب باقی نہ رہے۔ 'ثم اقضوا الی ولا تنظرون' 'اقضوا' کے بعد 'الی' اقدام پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قطعی فیصلہ کر کے مجھ پر اقدام کرو اور پھر مجھے ذرا مہلت

نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے وہ میری حفاظت فرمائے گا۔

فان تولیتم فما سألتکم من اجر ان اجری الا علی اللہ و
امرت ان اکون من المسلمین۔ ۷۲

یعنی اگر تم غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اسی روش اعراض پر جمے رہنا ہے تو مجھے اب تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمہیں جو تبلیغ و تذکیر کر رہا تھا اس کا میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہا تھا کہ اس سے محروم ہو جانے کا غم ہو۔ میری محنت کا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔ مجھ پر یہ ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی تھی کہ لازماً تم کو مومن و مسلم ہی بنا لوں، مجھے تو حکم ملا تھا کہ میں اپنے رب کے فرمانبرداروں میں بنوں۔ سو میں اسی کا فرمانبردار ہوں۔

فکذبوہ فنجینہ ومن معہ فی الفلک وجعلنھم خلٰئف و اغرقنا
الذین کذبوا بایٰتنا فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین، ۷۳۔

قریش کو انذار

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پہلے مکذبین کے غرق کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ حضرت نوحؑ اور ان کے باایمان ساتھیوں کی نجات کا ذکر فرمایا اس لئے کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر جب عذاب آیا ہے تو اللہ تعالےٰ نے اس سے پہلے اہل ایمان کی حفاظت کا اہتمام فرمایا ہے۔ 'وجعلنھم خلٰئف'، یعنی مکذبین کو غرق کر کے ان کی جگہ زمین کی وراثت حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو بخشی۔ 'فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین'، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس سرگزشت کے سنانے سے پیش نظر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتمام حجت ہو چکنے کے بعد جس طرح قوم نوحؑ کا بیڑا غرق ہو گیا اسی طرح قریش کا قصہ بھی پاک ہو جائے گا اگر انہوں نے تمہارے انذار سے آنکھیں نہ کھولیں۔

ثم بعثنا من بعدہ رسلا الی قومھم فجاءوھم بالبینٰت فما
کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل کذٰلک نطبع علی قلوب
المعتدین: ۷۴

بعد کے رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ

یہ ان رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد آئے۔ یہاں ان کی تفصیل نہیں کی ہے بلکہ سرسری اشارہ کر کے بعد والی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت لے لی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بعد والی سورہ۔ سورۂ ہود۔ میں آئی ہے جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہ السلام کا ذکر بھی مفصل ہوا ہے اور قوم نوحؑ اور قوم موسیٰ کے

حالات کے بھی بعض وہ گوشے روشنی میں آئے ہیں جو یہاں مخفی رہ گئے تھے۔ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے۔

توفیق ایمان کے باب میں سنت الٰہی

'فماکانو الیومنوا .... الآیہ' میں اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو توفیق ایمان کے باب میں بار بار بیان ہوئی ہے اور جس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں کہ جو لوگ عقل و فطرت کے بدیہیات اور یقینیات کو جھٹلا دیتے ہیں ان کو رسول کے انذار سے بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا ہے۔ ایسے لوگوں پر رسول کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتا ہے اور اس اتمام حجت کے نتیجہ میں ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ 'اعتداء' کے معنی حدود الٰہی سے تجاوز کے ہیں۔ جو لوگ خدا کے مقرر کئے ہوئے تمام حدود توڑ تاڑ کے رکھ دیتے ہیں ان کے اندر حدود کے احترام کا احساس ہی مردہ ہو جاتا ہے اور اس احساس کے مردہ ہو جانے کے بعد ان سے کسی خیر کی امید عبث ہے۔ ایسے مردے کسی کے جھنجھوڑنے سے بھی نہیں جاگتے۔

حضرت موسیٰ کا اتمام حجت

ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ وھٰرون الیٰ فرعون وملائہ

بایٰتنا فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین ۔ ۷۵

لفظ 'ملا' پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ 'آیات' سے مراد وہ آیات الٰہی بھی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو سنائیں اور وہ نشانیاں بھی ہیں جو انہوں نے ان کو دکھائیں۔ 'کانوا قوما مجرمین' سے اسی فساد قلب و عقل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے کہ چونکہ پہلے سے یہ اپنے دل اور عقل کی آنکھیں پھوڑ چکے تھے اس وجہ سے کسی چیز سے بھی انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس رسول کی حیثیت سے گئے تھے اس وجہ سے انہوں نے لازماً ان کے اوپر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بغیر رسول کا مشن پورا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون سے صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا، اس کے آگے ایمان و اسلام کی کوئی دعوت نہیں پیش کی۔

فلما جاءھم الحق من عندنا قالوا ان ھٰذا لسحر مبین ٥ قال

موسیٰ اتقولون للحق لما جاءکم ط اسحر ھٰذا ط ولا یفلح الساحرون ۔ ۷۶-۷۷

حق اور سحر کا فرق

'حق' کے معنی ہیں ایک واضح، مبرہن اور مدلل حقیقت۔ یہاں اس سے مراد حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کا فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ یہ دعویٰ ہے

کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ اس دعوے کی تردید میں انہوں نے کہا کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ جو نشانی تم دکھا رہے ہو یہ کوئی خدائی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ صریح جادو ہے، اور یہ چیز تم سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے جادوگروں کے پاس ہے۔

'اتقولون للحق لما جاءکم' میں 'تقولون' کا مفعول بتقاضائے بلاغت حذف ہے اور 'للحق' میں 'ل'، فی کے معنی میں ہے یعنی تم ایک واضح حق کے باب میں کہتے ہو کہ یہ سحر ہے۔ لفظ سحر کو یہاں حذف کر دینے سے یہ بات نکلتی ہے کہ متکلم کو حق کے باب میں یہ نقل کفر بھی اس درجہ ناگوار ہے کہ وہ اپنی زبان کو اس سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ 'لما جاءکم' کی بلاغت بھی یہاں قابلِ لحاظ ہے۔ 'حق' جب تک نگاہوں سے اوجھل ہو اس وقت تک تو اس کی نسبت کوئی شخص اگر کوئی نظریاتی بحث اٹھائے تو اس کو کسی حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب حق سامنے موجود ہو تو اس کے باب میں کٹ حجتی کرنا ویسا ہی ہے جس طرح کوئی نصف النہار کے سورج کے بارے میں تردّد کا اظہار کرے۔ ہم سورہ اعراف میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر اور معجزہ کے درمیان جو فرق ہے وہ اصلاً منطق سے نمایاں نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے ظہور کی نوعیت، اذہان و قلوب پر دونوں کے اثرات اور دونوں کے پیش کرنے والوں کے کردار سے نمایاں ہوتا ہے۔ 'ولا یفلح الساحرون' یعنی ساحر کبھی کسی پائدار کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے۔ ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے۔ بالخصوص جب وہ حق کے مقابل میں آتے ہیں۔ تب تو وہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹک نہیں سکتے، معجزے کے آفتاب تاباں کے آگے ان کے دیے بالکل ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ جملہ حضرت موسیٰؑ کی طرف سے فرعونیوں کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر اس کو سحر کہتے ہو تو جب تم اس کے مقابلے کے لئے اپنے ساحروں کو لاؤ گے تو ساری حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ رسول کے معجزے اور ساحر کے سحر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ آباءنا و تکون لکما الکبریاء فی الارض و
نحن لکما بمومنین ۷۸

حضرت موسیٰ پر سیاسی الزام

فرعونیوں کا یہ فقرہ نہایت زہر آلود ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف بھڑکانے کے لیے ان پر آبائی دین اور ملک کی حکومت، دونوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کا الزام تھوپ دیا کہ تم ہمارے آبائی دین سے بھی ہم کو برگشتہ کرنا چاہتے ہو اور تمہاری یہ آرزو بھی ہے کہ اس ملک کا اقتدار تم دونوں کے ہاتھ آ جائے۔ ہم سورۂ اعراف کی تفسیر میں تورات کے حوالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں کہ مصر میں اس وقت جو ارسٹو کریسی برسرِ اقتدار تھی وہ اسرائیلیوں کی روز افزوں ترقی پذیر تعداد سے بہت خائف تھی کہ مبادا ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ یہ قبطیوں کو ہٹا کر خود اقتدار پر قابض ہو جائیں چنانچہ

اسرائیلی بچوں کو قتل کر دینے کی جو سنگدلانہ سکیم چلائی گئی تھی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح بنی اسرائیل کی تعداد کو کنٹرول میں رکھا جا سکے۔ چونکہ یہ خطرہ ذہنوں میں موجود تھا اس وجہ سے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت بلند ہوئی تو اس کے خلاف یہ اشغلہ بھی چھوڑ دیا گیا کہ یہ ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تاکہ قبطی عصبیت پوری طرح ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔

وقال فرعون ائتونی بکل ساحر علیم ۝ فلما جاء السحرۃ قال لھم موسیٰ القوا ما انتم ملقون ۝ فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بہ السحر ط ان اللہ سیبطلہ ط ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین ۝ و یحق اللہ الحق بکلمتہ ولو کرہ المجرمون - ۷۹-۸۲

"وقال فرعون .... الآیہ" فرعون اور اس کے درباریوں سے یہ حقیقت تو مخفی نہیں ہو سکتی تھی کہ نہ حضرت موسیٰؑ ساحر ہیں اور نہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ سحر ہے لیکن چونکہ ان کی بات مان لینے کی صورت میں اس کو اپنی اور اپنی مزعومہ خدائی کی موت نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو مفر کی شکل یہی نظر آئی کہ ملک کے تمام جادوگروں کو بلا کر ان سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرایا جائے کہ شاید اس طرح کوئی بات بن جائے۔ اگرچہ یہ ایک صریح حماقت تھی لیکن کسی حقیقت کو نہ ماننے کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی خاطر انسان بہت سی حماقتیں کر گزرتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کا مقابلہ

"فلما جاء السحرۃ .... الآیہ" ساحروں سے حضرت موسیٰؑ کا یہ فرمانا کہ "جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو وہ پیش کرو" اپنے مشن پر غایت درجہ اعتماد کی دلیل ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر پورا بھروسہ تھا کہ خواہ جادو کر جتنا بڑا جادو بھی دکھائیں ان کے پاس اس کا توڑ موجود ہے اس وجہ سے انہوں نے کسی پیش بندی سے بے نیاز ہو کر انہی کو پہل کرنے کا موقع دیا اور یہ گویا میدان مقابلہ میں ان کی پہلی جیت تھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد حریف کو جو شکست ہوئی وہ خود اس کے اپنے منتخب کئے ہوئے میدان میں ہوئی۔

حضرت موسیٰؑ کا اعتماد علی اللہ

"فلما القوا .... الآیہ" - جب حضرت موسیٰؑ نے ان کا جادو دیکھا تو فرمایا "ما جئتم بہ السحر" کہ یہ جو کچھ تم نے دکھایا ہے، یہ جادو ہے۔ یہ فرعونیوں کے اس قول کا جواب ہے جو اپر آیت ۷۶ میں گزرا، "قالوا ان ھذا لسحر مبین" کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزے کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کے اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے معجزے کو جادو کہتے ہو، جادو وہ نہیں تھا، جادو یہ ہے جو تم نے پیش کیا ہے اور تم اب حق کے مقابلہ میں اس کی بے حقیقتی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ "ان اللہ سیبطلہ" (اللہ اس کو نابود کر دے گا) اس لیے کہ باطل اپنی چمک دمک اسی وقت تک دکھاتا ہے جب تک حق سے اس کا مقابلہ نہیں ہوتا، جب حق ظاہر ہو جاتا ہے تو باطل جھاگ کی طرح بیٹھ جایا کرتا

باطل کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے

ہے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام میں یوں فرمائی گئی ہے۔ 'جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا' (حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اس لئے کہ باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)

حق غالب ہو کر رہتا ہے۔

ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین' لفظ 'اصلاح' یہاں بار آور اور نتیجہ خیز کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی معنی میں لفظ سورہ محمدؐ آیات ۲ - ۵ میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی مصلحین جو حق لے کر اٹھتے ہیں ان کے مقابل میں مفسدین کی مفسدانہ کوششیں کبھی بار آور نہیں ہوتیں۔ امتحان و آزمائش کا مرحلہ گزرنے کے بعد غلبہ بالآخر حق ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

'ویحق اللہ الحق .... الآیۃ' یعنی مجرمین و مفسدین خواہ حق کو دبانے کی کتنی ہی کوششیں کریں لیکن جو لوگ اللہ کا کلمہ لے کر اٹھتے ہیں، اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کرتا ہے۔[1]

فما آمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ علی خوف من فرعون و ملائھم ان یفتنھم ط وان فرعون لعال فی الارض و انہ لمن المسرفین ۵ ۸۳

حضرت موسیٰؑ کے ابتدائی ساتھی

'ذریۃ' کا لفظ صرف قلت تعداد کو ظاہر نہیں کرتا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر ابتدائی ایمان لانے والے ان کی قوم کے اندر سے صرف تھوڑے سے نوجوان تھے۔ حضرات انبیاء کے معاملے میں سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ مشروع شروع میں ان کا ساتھ بالعموم نوجوانوں نے ہی دیا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتی ہے اور دوسرے انبیاء کی تاریخ بھی اگر تفصیل سے معلوم ہو سکے تو اس سے بھی یہی بات ثابت ہو گی۔ اس کی واضح نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء جس ہمہ گیر دعوت اصلاح کو لے کر اٹھتے ہیں اس کو ابتدائی مراحل میں آگے بڑھ کر قبول کرنا بڑی بلند حوصلگی بلکہ بڑے جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ اس کی ہمت وہ لوگ آسانی سے نہیں کر سکتے جو روایات و رسوم سے مرعوب اور حالات و مصالح کی رعایت کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگوں کا حجاب آہستہ آہستہ ہی ٹوٹتا ہے۔ نوجوانوں میں اس قسم کی مرعوبیت و

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں حق و باطل کی وہ کشمکش زیر بحث ہے جو ایک رسول کی بعثت سے ظہور میں آتی ہے۔ رسول کے لیے، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں، بالآخر غلبہ لازمی ہے۔

مغلوبیت کم ہوتی ہے اس وجہ سے ان کو جب دعوت حق اپیل کرتی ہے تو وہ اس کے لیے دنیوی عواقب سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی سرزنش کی کچھ زیادہ پروا کرتے اور نہ وقت کے ارباب اقتدار کی برہمی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے معاملے میں حالات کا یہ خاص پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ملک میں جو ارسٹوکریسی برسر اقتدار تھی وہ نسلاً بھی حضرت موسیٰؑ کی قوم سے بالکل الگ تھی اور اس دور میں جو شخص تخت حکومت پر تھا، وہ بھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ سے واضح ہے، طبعاً نہایت جبار اور سرکش تھا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ وہی لوگ ان کا ساتھ دینے کے لئے آگے بڑھ سکتے تھے جو اپنی حمیت حق کے جوش و جذبہ کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

'آمن لہ' اور 'آمن بہ' کا فرق

ان نوجوانوں کے ایمان کو قرآن نے 'آمن لہ' سے تعبیر کیا ہے۔ عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ 'آمن لہ' اور 'آمن بہ' میں بڑا فرق ہے۔ 'آمن لہ' تو یہ ہے کہ آپ کسی شخص کے دعوے یا اس کی خبر کو سچ مان لیں۔ اس کے لیے حوالگی، تفویض، تسلیم اور انقیاد و اطاعت شرط نہیں ہے، لیکن 'آمن بہ' کا تقاضا پورا کرنے کے لیے یہ ساری چیزیں شرط ہیں۔ نبی اور رسول کے معاملے میں صرف 'آمن لہ' کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے 'آمن بہ' کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اس مرحلے تک کچھ اسرائیلی نوجوانوں نے حضرت موسیٰؑ کے دعوے کی صداقت تو تسلیم کر لی تھی لیکن ابھی 'آمن بہ' کے مقام تک وہ نہیں پہنچے تھے اس وجہ سے ان کے اعتراف و قبولیت کو قرآن نے 'آمن لہ' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حقیقت چونکہ حضرت موسیٰؑ پر واضح تھی اس وجہ سے انہوں نے ان نوجوانوں کو ایمان کی اصل حقیقت سمجھائی جس کا ذکر آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

بنی اسرائیل کے اکابر کا حال

'ملا ئہم' میں ضمیر کا مرجع ذریت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان نوجوانوں کو فرعون کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ حمایت موسیٰؑ کے جرم میں ان کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے اور اپنی قوم اور ملک کے اعیان و اکابر سے بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ ہم حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہیں تو جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس مرحلہ تک خود بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کا رویہ بھی، حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہمدردی کے باوجود یہی تھا کہ وہ اپنے یا اپنی اولاد کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

'وان فرعون لعال فی الارض وانہ لمن المسرفین' یعنی اوّل تو فرعون نہایت متکبر اور جبار تھا کہ اپنے آگے کسی کو سر اٹھاتے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا، دوسرے یہ کہ جب ظلم کرنے پر آتا تو اس کے ظلم کی کوئی حد نہ رہتی، بلکہ تمام حدود لانگ جاتا۔

وقال موسٰی یٰقوم ان کنتم آمنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین ۝ فقالوا علی اللہ توکلنا ربنا لاتجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین ۝ ونجنا برحمتک من القوم الکافرین ۝ ۸۴-۸۶

ایمان کی اصل حقیقت

'وقال موسٰی ... الآیۃ' یہ حضرت موسٰیؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو ایمان باللہ کی حقیقت سمجھائی ہے کہ اگر ایمان کا اظہار کیا ہے تو اس ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کسی کا ڈر اور کسی کا لحاظ حائل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہو کر اللہ کی راہ میں بڑھنا چاہیئے اور اللہ پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ جس نے یہ راہ کھولی ہے وہی اس میں پیش آنے والی مشکلات میں یار و ناصر ہوگا۔ گویا ایمان کا لازمی تقاضا خدا پر توکل ہے اور اس توکل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دے۔ یہی حوالگی اصل اسلام ہے۔

توکل کی حقیقت

'فقالوا علی اللہ توکلنا ... الآیۃ' حضرت موسٰیؑ کے ساتھیوں نے ان کی یہ تعلیم قبول کی اور چونکہ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اس توکل کے معنی گوشہ نشینی کے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جاں بازی کے ہیں اس وجہ سے عزم بالجزم کے اظہار کے ساتھ ہی انہوں نے دعا کی کہ اے رب ہمیں ظالموں کے لئے فتنہ نہ بنانا۔ 'فتنہ' کے معنی یہاں ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے ہم کو بالکل ہی مظالم کا آماجگاہ بنا لیں۔ اس سے معلوم اللہ پر توکل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جس طرح بندے کا عزم راسخ ضروری ہے اسی طرح ہر قدم پر خدا سے دعا اور استعانت بھی ضروری ہے کہ وہ راہ کے فتنوں سے امان میں رکھے اور جو فتنے پیش آئیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔

'ونجنا برحمتک ..... الآیۃ' چونکہ یہ بات ابتدائی مرحلے میں ہی واضح ہو چکی تھی کہ حضرت موسٰیؑ بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی غلامی سے چھڑانا چاہتے ہیں اس وجہ سے اس مقصد عزیز کے لیے بھی انہوں نے دعا کی۔ یہ دعا گویا ہجرت کی کامیابی کے لیے تھی۔

واوحینا الی موسٰی واخیہ ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا واجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ ط وبشر المومنین ۝ ۸۷

صبر اور توکل کے حصول کی تدبیر

یہ تدبیر ارشاد ہوئی ہے اس صبر اور توکل کے حصول کی جس کی تعلیم اوپر کی آیات میں دی گئی ہے۔ حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم ہوا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مقام نماز باجماعت کے لیے مخصوص کر لو جن میں بنی اسرائیل معیّن اوقات پر نماز کے لئے جمع ہوا کریں اور تم اپنے گھروں کو

قبلہ قرار دے کر نماز باجماعت کا اہتمام کرو۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی پُرمصائب زندگی میں دی گئی تھی۔ صبر و توکل اور نماز کے باہمی تعلق پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں۔

دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ

مصر کی غلامانہ زندگی میں بنی اسرائیل اپنی مذہبی تنظیم کی تمام خصوصیات سے محروم ہو گئے تھے۔ ازاں جملہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتماعی نماز و دعا کی بھی کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب جبکہ حضرت موسیٰؑ نے ان کے اندر تجدید کا کام شروع کیا تو ظاہر ہے کہ اس کا آغاز اسی نقطہ سے ہونا تھا جو دینی تنظیم کا ابتدائی نقطہ ہے۔ چنانچہ ان کو نماز کے قیام و اہتمام کا حکم ہوا اور اس کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مکانات مسجد کی حیثیت سے مخصوص کر لئے جائیں جن میں بنی اسرائیل اوقات نماز میں مجتمع ہو جایا کریں۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ تمام بنی اسرائیل کا مصر کے مختلف حصوں سے ایک جگہ جمع ہونا ناممکن ہوتا۔

جب متعدد مسجدیں ہوئیں تو ان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوا کہ کوئی مسجد سب کے قبلہ کی حیثیت سے معین ہو۔ اس کے لیے حکم ہوا کہ 'واجعلوا بیوتکم قبلۃ' اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ۔ میرا ذہن ان الفاظ سے اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ گھر ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے آس پاس کے بنی اسرائیل کی نماز کے لیے مخصوص فرمائے ہوں گے۔ چونکہ دعوت و ہدایت کے مرکز کی حیثیت انہی گھروں کو حاصل تھی اس وجہ سے اس عبوری دور میں انہی گھروں کو عارضی طور پر قبلہ کی حیثیت دے دی گئی۔ بعد میں جب بنی اسرائیل نے ہجرت کی تو اس کے بعد سے بیت المقدس کی تعمیر تک ان کے ہاں قبلہ کی حیثیت اس تابوت کو حاصل رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

'وبشر المومنین' یہ اہل ایمان کو بشارت ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہیں گے، نماز کا اہتمام رکھیں گے، اللہ ان کو تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رکھے گا اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح عطا فرمائے گا۔ اس بشارت کا ذکر آیت ۲ میں گزر چکا ہے، وبشر الذین امنوا ان لھم قدم صدق عند ربھم (اور ایمان لانے والوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس عزت کی پائگاہ ہے) اور خاص بنی اسرائیل کے یہ بشارت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کا ذکر آگے آیت ۹۲ میں ہوا ہے۔

وقال موسیٰ انک آتیت فرعون وملاءہ زینۃ واموالاً فی الحیوٰۃ الدنیا

لا ربّنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی
قلوبھم فلا یومنوا حتیٰ یروا العذاب الالیم ۰ ۸۸

رسولوں کے مکذبین کے بارے میں سنت الٰہی

یہ دعا حضرت موسیٰؑ نے اس وقت فرمائی ہے جب سارے جتن کر چکنے کے بعد وہ فرعون اور اس کی قوم کے ایمان سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہی مرحلہ ہے جس میں حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے معاندین کے لیے ان الفاظ میں دعا کی۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۰ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۰ ...... وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ...... وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۰ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۰

۲۱-۲۷ نوح

نوحؑ نے دعا کی، اے میرے رب انہوں نے میری بات رد کر دی اور اس کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اس کے خسارے ہی میں اضافہ کیا اور انہوں نے بڑی بڑی چال چلی ...... اور انہوں نے بہتوں کو گمراہ کر ڈالا اور تو ان ظالموں کی ضلالت ہی میں اضافہ کر ...... اور نوحؑ نے دعا کی اے میرے رب، تو زمین پر کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے گا یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف فاجر کاروں اور ناشکروں کو جنم دیں گے۔

یہ بات ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے اتمام حجت کے بعد بھی اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر قبول حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اب اگر وہ خدا کی زمین پر باقی رہے تو دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے اندر سے کسی خیر کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ جن قوموں پر کسی رسول کے ذریعہ سے حجت تمام ہوئی ہے اس کے مکذبین ایک خاص حد تک مہلت دیئے جانے کے بعد لازماً تباہ کر دیئے گئے ہیں۔ اس دنیا کے اندر زندگی کی جو مہلت قوموں کو ملتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ملتی ہے، شر محض کی پرورش اس کائنات کے مزاج کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ

نے یہ دعا اس وقت کی ہے جب ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ان سرکشوں کی آنکھوں کی پٹی عذاب الٰہی کے سوا اب کوئی اور دوسری چیز نہیں کھول سکتی۔

'ربنا لیضلوا عن سبیلک' عربی میں 'ل' بسا اوقات کسی چیز کے اس انجام اور نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے جو اس سے ظہور میں آتا ہے۔ یعنی تو نے ان کو جو مال و اسباب عطا فرمائے وہ ان کے لیے شکر گزاری کے بجائے طغیان و فساد کا سبب بنے اس وجہ سے، اے ہمارے رب، اب تو ان کو مزید مہلت نہ دے کہ یہ تیری مخلوق کو گمراہ کریں۔ 'ربنا اطمس علی اموالھم و اشدد علی قلوبھم' اور ان کے دلوں پر وہ پٹی باندھ جس کو تیرا عذاب ہی کھولے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والوں نے رسول کے تمام دلائل اور تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ جب تک ان کو وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس وقت تک وہ ایمان نہیں لانے کے۔ یہی مطالبہ فرعون اور اس کی قوم کا بھی تھا۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر، ان کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو جانے کے بعد، حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اسی چیز کی درخواست کی جس کے لئے وہ بضد تھے

قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون۔ ۸۹

جو دعا صحیح طریقہ اور ٹھیک وقت پر کی جاتی ہے اس کی قبولیت میں دیر نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون پر دعوت و اصلاح اور انذار و تبلیغ کی جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی چونکہ وہ کما حقہٗ ادا ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کی دعا قبول ہو گئی اور ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ اب آگے کے مرحلہ میں ان سرکشوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرنے والا ہے اس کو جی کڑا کر کے دیکھنا۔ ان کی درگت دیکھ کر ان کے لیے دل میں نہ کوئی نرمی و رأفت پیدا ہو، نہ ان کے حق میں کوئی کلمۂ سفارش کہنا اور نہ کسی پہلو سے اب ان کی چھوت تم کو یا تمہارے ساتھیوں کو لگنے پائے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت حضرت نوحؑ کو، ان کی قوم کے باب میں فیصلۂ عذاب ہو جانے کے بعد کی گئی تھی جس کا ذکر سورۂ ہود میں یوں ہوا ہے۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ۔ ۳۷ ہود	اور کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ لازماً غرق کئے جائیں گے۔

بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو یہ ہدایت

کی گئی۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ
تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ وَلَا
تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ
النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ
مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ○

ھود ۱۱۲-۱۱۳

پس جس طرح تمہیں حکم ملا ہے تم اور جن لوگوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے، جمے رہو اور سرکشی نہ کیجیو، بے شک وہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہوجیو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ تم کو بھی دوزخ کا عذاب پکڑے اور تمہارے لیے اللہ کے مقابل میں کوئی مددگار نہ ہو، پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔

اس قسم کی تنبیہ کا مقصد درحقیقت اپنے گلے کے راعیوں کو ہوشیار و آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ چوکنے رہو کہ تمہارے گلے کی کوئی بھیڑ اس گلے سے نہ جاملے جس کی ہلاکت اب مقدر ہو چکی ہے اور جس پر اللہ کا عذاب بس آنے ہی والا ہے۔ اس قسم کے مواقع میں خطاب بظاہر پیغمبر سے ہوتا ہے لیکن کلام کا رخ، جیسا کہ دوسرے مواقع میں ہم واضح کر چکے ہیں، دوسروں کی طرف ہوتا ہے چنانچہ ہود کی محولہ بالا آیات میں اس کی وضاحت بھی ہوگئی ہے کہ خطاب پہلے واحد سے ہوا، پھر صیغہ جمع کا آگیا۔

وجوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتبعهم فرعون وجنوده بغیا وعدوا ۚ
حتیٰ اذا ادرکه الغرق قال آمنت انه لا اله الا الذی آمنت به
بنو اسرائیل وانا من المسلمین ○ آلئٰن وقد عصیت من قبل
وکنت من المفسدین ○ فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک
آیة ۚ وان کثیرا من الناس عن آیاتنا لغفلون ○ ۹۰-۹۲

"وجوزنا ببنی اسرائیل البحر ...... الآیه" یہ خاص خدائی اہتمام میں بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دینے کی تعبیر ہے گویا کوئی کسی کو اپنے کندھے پر سوار کرا کے دریا پار کرا دے۔ اس کی شکل کیا ہوئی؟ یہ سوال بحث طلب ہے۔ ہم اس سوال پر اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ قدرت کے عجائب تصرفات میں سے ہے کہ جس مقام سے سمندر نے بنی اسرائیل کو خشک راستہ دیا اسی مقام سے گزرتے ہوئے فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ غرق ہوگیا۔ فرعون کے اس

تعاقب کو قرآن نے 'بغی' اور 'عدو' یعنی سرکشی اور تعدّی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور تعدّی تھا لیکن اس کا یہ پہلو خاص طور پہ یہاں قابلِ لحاظ ہے کہ ایک مدت کی کشمکش کے بعد فرعون نے خود بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اجازت کے بعد پیچھے سے ان پر فوجیں لے کر چڑھ دوڑنا ایک ایسی زیادتی تھی جو اس کی تمام زیادتیوں پہ بازی لے گئی۔ ڈوبتے وقت فرعون کا اقرارِ توحید اس تصریح کے ساتھ کہ 'لا اله الا الذی اٰمنت به بنو اسرائیل' اس کی بے بسی کی کامل تصویر ہے جو فراعنہ اور متمردین پہ اس وقت طاری ہوا کرتی ہے جب وہ خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ اس وقت وہ ناک رگڑ رگڑ کے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کرتے ہیں جس کا نام سننا بھی ان کو اس سے پہلے گوارا نہیں ہوتا۔

'آلٰئن وقد عصیت ... الاٰیة' یعنی اب ماننے جب ماننے کا وقت گزر گیا۔ اب مسلم بننے کا اقرار کرتے ہو درآنحالیکہ ساری زندگی فساد میں گزری! یہ ضروری نہیں کہ یہ بات قولاً کہی گئی ہو بلکہ غالب یہ ہے کہ یہ صورت حال کی تصویر ہے۔

قدرت کے انتقام کی ایک نشانی

'فالیوم ننجیك ببدنك لتکون لمن خلفك ... الاٰیة' قدرت کے انتقام کی اس عظیم نشانی کے اندر ایک دوسری عظیم نشانی یہ ظاہر ہوئی کہ فرعون کی لاش کو سمندر نے قبول نہیں کیا بلکہ اس کو ایک نشانِ عبرت بنانے کے لیے باہر پھینک دیا اور یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو خدائی کا مدعی تھا اس کا انجام کیا ہوا۔ مصر میں لاشوں کو ممی کر کے محفوظ کرنے کا رواج تھا اور ایک فرعون کی ممی کی ہوئی لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ اس لاش کے بارے میں اثریات کے ماہرین چاہے اختلاف کریں کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے یا کسی اور کی لیکن ان کے اٹکل پچو اندازوں کے مقابل میں قرآن کا یہ چودہ سو سال پہلے کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس طرح قدرت نے اس کی لاش کو عبرت کی ایک ایسی نشانی بنا دیا جو آج کے فرعونوں کے لیے بھی محفوظ ہے۔ لیکن دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت ہے اور اس دنیا میں عبرت پذیر آنکھوں سے زیادہ کم یاب کوئی شئے بھی نہیں۔ 'وان کثیرا من الناس عن اٰیٰتنا لغٰفلون' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ولقد بوّانا بنی اسرائیل مبوّا صدق ورزقنٰھم من الطیّبٰت فما
اختلفوا حتّٰی جاءھم العلم ؕ ان ربّك یقضی بینھم یوم القیٰمة
فیما کانوا فیه یختلفون ۝ ۹۳

'تبویہ' کے معنی متمکن کرنے کے ہیں اور 'صدق' کی طرف اس کی اضافت اس کے اندر مزید قوت و

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام اور ان کی ناشکری

استحکام کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کے دشمن کو پامال کیا اور بنی اسرائیل کو اپنے منتخب کردہ علاقے میں اقتدار و استحکام بخشا۔ یہ منتخب علاقہ، جیسا کہ سورہ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، اردن اور شام کا علاقہ ہے۔ ورزقنٰھم من الطیّبٰت' سے علاقے کی زرخیزی و شادابی کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں اور قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔
'فما اختلفوا حتیٰ جاءھم العلم' اب یہ اس ناشکری اور ناسپاسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالےٰ کے اتنے عظیم احسانات کے مورد ہونے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی کتاب و شریعت کے معاملے میں یہود نے کی۔ انہوں نے اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پیدا کر کے پائی ہوئی حقیقت گم کر دی اور اسی سرگشتگی اور حیرانی میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے اللہ تعالےٰ نے اس اہتمام سے ان کو نکالا تھا۔ 'حتیٰ جاءھم العلم' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ بدقسمت قوم ہے جس نے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی ہے اس وجہ سے سارا بارِ الزام اس کے اپنے ہی کندھوں پر ہے۔ 'ان ربک یقضی بینھم .... الاٰیۃ' یہ دھمکی ہے یہود کو کہ آج انہوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں جو دھاندلی مچائی ہے اور کتابِ الٰہی کی جن حقیقتوں پر پردہ ڈالا ہے سب کے فیصلے کے لیے اللہ نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ اس دن ان کا سارا کچا چٹھا ان کے سامنے آ جائے گا اور ہر شخص اپنے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔

۱۲- آگے کا مضمون - آیات ۹۴ تا ۱۰۹

خاتمۂ سورہ

آگے کا مضمون خاتمہ سورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مکذبین پر عتاب ہے کہ ان کی روش تمہیں کسی تردد میں نہ ڈالے۔ جو چیز تم پر اتاری گئی ہے اگر یہ لاخیرے قسم کے لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پہلے سے کتاب کے حامل رہے ہیں۔ ان سے پوچھو تو وہ اس حق کی تائید کریں گے۔
اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی کہ یہ نہ خیال کرو کہ جو لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں اگر ان کو ان کے حسبِ منشا کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ مومن بن جائیں گے۔ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہوں ان کو دنیا جہان کی نشانیاں دکھا دو پھر بھی وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ تاریخ میں صرف ایک مثال قوم یونس کی موجود ہے کہ وہ عذاب کے کنارے پہنچتے پہنچتے سنبھل گئی اور اس کے ایمان سے اس کو نفع پہنچا۔ اللہ تعالےٰ کو لوگوں کا ایمان لانا بہت محبوب ہے لیکن وہ چاہتا ہے

کہ لوگ اپنے ضمیر اور ارادے کی آزادی اور آفاق و انفس کی نشانیاں دیکھ کر ایمان لائیں۔ اس معاملے میں نہ وہ جبر کو پسند کرتا اور نہ لوگوں کے مطالبۂ معجزات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جن کو نشانیاں مطلوب ہوں وہ آسمان و زمین کی نشانیوں پر غور کریں اور جن کو اس طرح کا کوئی عذاب مطلوب ہو جس طرح کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے ان سے کہہ دو کہ اس کے لئے انتظار کرو میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

عقیدۂ توحید کا اعلان

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دوٹوک الفاظ میں عقیدۂ توحید کا اعلان کرایا ہے اور یہ اعلان گویا دین کفر و شرک سے آخری برأت و بیزاری کا اعلان ہے تاکہ مشرکین آخری درجے میں سمجھوتے کی توقع سے مایوس ہو جائیں اور جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر گزریں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ
كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى
يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ ۝ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ
فَنَفَعَهَآ إِيْمَانُهَآ إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ
عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ إِلٰى حِيْنٍ ۝
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ أَفَأَنْتَ
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ
أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ
لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي
الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ
إِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْا
إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ

إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ
مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ
أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾ وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا
وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا
يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٦﴾
وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن
يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ
مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٧﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ
قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي
لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم
بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ
وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

پس اگر تم شک میں ہو اس چیز کے باب میں جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک تم پر تمہارے رب کی طرف سے حق نازل ہوا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ تم بھی نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔ بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لانے کے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا بجز یونس کی قوم کے۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو کھانے پینے کا موقع دیا۔ ۹۴-۹۸

اور اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ بھی ہیں سب ایمان قبول کر لیتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن بن جائیں؟ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کے اذن سے۔ اور وہ گندگی لاد دیا کرتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۹۹-۱۰۰

ان سے کہو، آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے اس کو دیکھو۔ اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کچھ نفع نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن ان لوگوں کو پیش آئے جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دو، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم نجات دیتے رہے ہیں اپنے رسولوں کو اور ایمان لانے والوں کو۔ ایسے ہی ہم پر حق ہے، ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۳

کہہ دو، اے لوگو! اگر تم میرے دین کے باب میں شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان کو نہیں پوجتا جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بلکہ میں اس اللہ کو پوجتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت کی طرف کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو نہ پکارو جو نہ تم کو نفع پہنچائیں نہ نقصان، اگر تم ایسا کرو گے تو بے شک تم ظالموں میں سے بن جاؤ گے اور اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں پکڑے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے اور اگر وہ تمہارے لئے کوئی بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل کو روکنے والا نہیں، وہ اس سے نوازتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے۔ اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۰۴-۱۰۷

کہہ دو، اے لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے تو جو ہدایت قبول کرے گا وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پہ آئے گا۔ اور میں تمہارے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں، اور تم پیروی کرو اس چیز کی جو تم پہ وحی کی جاتی ہے اور ثابت قدم رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۱۰۸-۱۰۹

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

فان کنت فی شک مما انزلنا الیک فسئل الذین یقرءون الکتاب من قبلک ۚ لقد جاءک الحق من ربک فلا تکونن من الممترین ۝ ولا تکونن من الذین کذبوا بآیات اللہ فتکون من الخسرین ۹۴-۹۵

خطاب پیغمبر سے، عتاب مکذبین پر

'فان کنت فی شک ..... الآیہ' ہم دوسرے مقام میں ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ خطاب بظاہر الفاظ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رخ

منکرین و مکذبین کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضد کے سبب سے چونکہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے بات پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ ایک سورج کی طرح واضح حق کی مخالفت پر بھی اگر یمین ویسار کے سارے ہی لوگ اکٹھا کر لیں تو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک نیک اور راست باز آدمی کے دل میں بھی وہ کچھ تردد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے تردد سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ تنبیہ فرما دی گئی کہ ان مکذبین کا رویہ اس حق کے باب میں تمہیں کسی تردد میں نہ ڈالے جو اللہ نے تم پر اتارا ہے۔ 'فسئل الذین یقرءون الکتاب من قبلک' اگر یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ اس نعمت کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، جو لوگ پہلے سے کتاب کے حامل ہیں اور اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں ان سے پوچھو تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ 'یقرءون' فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس سے اشارہ یہاں صالحین اہل کتاب کی طرف ہے جن کی تائید و تصدیق کا حوالہ قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے۔ اس میں ان صالحین کی حوصلہ افزائی بھی ہے اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس حق کا لوگوں سے تعارف کرائیں جس سے وہ پہلے سے تعارف کی سعادت رکھتے ہیں۔

'ولا تکونن ..... الآیۃ' اس میں بھی خطاب پیغمبر سے ہے لیکن عتاب کا رخ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کی طرف ہے۔

یہاں جس انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اسی انداز میں سورہ ہود میں بھی تسلی دی گئی ہے۔ فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ڰ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ۱۷ ہود	کیا وہ جو اپنے رب کی بخشی ہوئی ایک واضح دلیل پر ہے، اس کے بعد مزید برآں اس کی طرف سے ایک شاہد آتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہی لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور جماعتوں میں سے جو بھی اس کا انکار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہے تو تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو یہ تمہارے رب کی جانب سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

ان الذین حقت علیھم کلمت ربک لا یومنون ○ ولو جاءتھم کل اٰیۃ حتّٰی یروا العذاب الالیم ○ ۹۶-۹۷

ایک سنتِ الٰہی

ان الذین حقت علیھم ..... الآیۃ ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا اشارہ پیچھے آیت ۳۳ میں گزر چکا ہے ' کذٰلک حقت کلمت ربک علی الذین فسقوا انھم لا یومنون ' (اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جن لوگوں نے نافرمانی کی ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے) یعنی جو لوگ حق واضح ہونے کے باوجود اندھے بہرے بنے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس کے بعد ان کو ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

' ولو جاءتھم کل اٰیۃ ..... الآیۃ ' یعنی ایسے لوگوں کی آنکھیں کسی معجزے سے بھی نہیں کھلتیں خواہ انہیں کتنے ہی معجزے دکھا دیئے جائیں۔ ایسے لوگ صرف اس عذاب کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں جو ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر نازل فرماتا ہے۔ لیکن عذاب کو دیکھ کر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں۔

فلولا کانت قریۃ اٰمنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس ط لما اٰمنوا کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا و متعنٰھم الٰی حین ○ ۹۸

تاریخ کی روشنی میں پیغمبر صلعم کو تسلی

یہ تاریخ کی روشنی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ان میں سے کسی رسول کی قوم کے لوگ بھی رسول پر اس وقت ایمان نہیں لائے جس وقت ایمان لانا نافع ہوا کرتا ہے بلکہ اللہ کا عذاب دیکھ کر ایمان لائے جب ایمان لانا بے سود ہو جاتا ہے۔ صرف ایک مثال قوم یونس کی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس قوم کے لوگ بے شک عذاب کی گھڑی کے ظہور سے پہلے پہلے چوکنے ہو گئے، اللہ نے ان کو ایمان لانے کی توفیق بخشی، یہ ایمان لائے اور ان کے ایمان سے ان کو نفع پہنچا کہ اس عذاب سے یہ محفوظ رہے جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں باقی رہ گئی تھی [1]

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ اس میں قریش کے لیے بھی ترہیب و ترغیب ہے

---

[1] حضرت یونس علیہ السلام کے اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانے کے واقعہ کی طرف یہاں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم بھی اس سے یہاں بحث نہیں کرتے۔ اس کے محل میں انشاء اللہ ہم اس کی نوعیت واضح کریں گے۔

قریش کو تنبیہ و تہدید

کہ اب تمہارا پیمانہ بھی لبریز ہوا چاہتا ہے۔ اگر تم جلد متنبہ نہ ہوئے تو وہی انجام دیکھو گے جو دنیا کی بہت سی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ اب بھی موقع باقی ہے کہ تم ہلاکت کی اس عام راہ پر جانے کے بجائے قوم یونس کی روش اختیار کرو کہ تمہارا ایمان تمہارے لیے نافع ہو اور تم اس عذاب سے بچائے جاؤ جو تم پر منڈلا رہا ہے ۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم پر کوئی اس طرح کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کا عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آیا بلکہ آپ کی قوم کے وہ سارے لوگ آہستہ آہستہ داخل ایمان ہوگئے جن کے اندر کچھ صلاحیت تھی، صرف شریر قسم کے لوگ اس سے محروم رہے اور وہ مختلف قسم کے غزوات میں اہل حق کی تلواروں سے ختم ہوگئے۔

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین ٥ وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ ط ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون ٥ ۹۹-۱۰۰

پیغمبر صلعم کو تسلی

'ولو شاء ربک..... الآیۃ' یہ بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے تم پریشان نہ ہو، اللہ تعالے کو لوگوں کا ایمان لانا بہت پسند ہے بشرطیکہ لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں ایمان لائیں۔ اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ جبر کو پسند فرماتا تو سارے ہی لوگوں کو مومن بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تمہارا فرض صرف حق تبلیغ ادا کر دینا ہے۔ یہ کام تم نے کر دیا۔ اس کے بعد لوگ ایمان نہیں لاتے تو ذمہ داری تمہاری نہیں ہے، لوگوں کی اپنی ہے۔ اب خدا کے ہاں پرسش ان سے ہوتی ہے نہ کہ تم سے۔ تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو لازماً ایمان کے راستہ پر چلا ہی دو۔

ایمان لانے کے باب میں سنت الٰہی

'وما کان لنفس...... الآیۃ' ایمان لانے اور نہ لانے کے باب میں جو سنت الٰہی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی ایمان لاتا ہے وہ اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے ایمان لاتا ہے۔ اور یہ توفیق ان کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے ان کی بصیرت پر اللہ تعالے ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے جو ان کو بالکل اندھا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے ہی بھٹکتے پھرتے ہیں۔

قل انظروا ماذا فی السموٰت والارض ط وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون ٥ فھل ینتظرون الا مثل ایام الذین خلوا من قبلھم ط قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین ٥ ثم ننجی رسلنا والذین اٰمنوا

کذالک حقا علینا ننج المومنین ۱۰۱ - ۱۰۳

مطالبہ معجزات کا جواب

'قل انظروا ..... الآیہ' یہ کفار کے مطالبۂ معجزات کا جواب دلوایا ہے کہ آسمان و زمین معجزات اور نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں، ان سے کہو کہ معجزات کی طلب ہے تو ان نشانیوں اور معجزات کو دیکھو، یہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بعد وضاحت فرما دی کہ نشانیاں اور ڈراوے انہی لوگوں کو نفع دیتے ہیں جن کے اندر ان سے نفع اٹھانے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کو کوئی نشانی اور کوئی ڈراوا بھی کچھ نفع نہیں پہنچاتا۔ 'یومنون' فعل یہاں ارادہ فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'نُذُر' سے مراد خاص طور پر وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ لوگوں کے اندر اپنا خوف پیدا کرنے کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔

'فھل ینتظرون ..... الآیہ' یعنی آفاق و انفس کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں کے اندر انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تو اس قسم کے کسی فیصلہ کن عذاب کے منتظر ہیں جس قسم کے فیصلہ کن عذاب عاد و ثمود وغیرہ قوموں پر آ چکے ہیں۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر اس قسم کے کسی عذاب کا انتظار ہے تو انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ یعنی اس قسم کے کسی عذاب کا لانا میرے اختیار کی بات نہیں ہے، یہ اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے۔ البتہ اس کے قرائن و آثار تمہارے اندر جمع ہوتے دیکھ رہا ہوں اس وجہ سے تم بھی اس کا انتظار کرو، میں بھی اس کا انتظار کرتا ہوں۔

قریش کو تنبیہ

'ثم ننجی رسلنا والذین امنوا ..... الآیہ' اب اس عذاب کا نتیجہ بتا دیا کہ کوئی اس کو بچوں کا کھیل نہ سمجھے۔ جب ہم اس قسم کا فیصلہ کن عذاب بھیجتے ہیں تو پھر اس سے نجات ہمارے رسول اور ان پر ایمان لانے والے ہی پاتے ہیں باقی سب اس کی لپیٹ میں آ کر فنا ہو جاتے ہیں۔ 'کذالک حقا علینا ننج المومنین' یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ یہ جو سنت الٰہی بیان ہوئی ہے اب اسی کی زد میں تم بھی ہو۔ اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم تمہارے معاملے میں بھی کریں اور ان لوگوں کو نجات دیں جو ایمان لائے ہیں۔

ہم دوسرے مقام میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ رسولوں کے مکذبین پر جب آخری فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے لازماً اس سے بچا لیے جاتے ہیں، صرف وہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں جو رسول کی تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ یہ ضابطہ صرف فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہے۔ عام آزمائشیں جو محض تذکیر کے لیے ظاہر ہوتی ہیں وہ مومن و کافر سب کے لیے یکساں ہوتی ہیں البتہ مومن اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کافر ان سے اپنے اوپر صرف اللہ کی حجت تمام کراتے ہیں۔

قل یا ایھا الناس ان کنتم فی شک من دینی فلا اعبد الذین تعبدون

من دون اللہ ولکن اعبد اللہ الذی یتوفکم وامرت ان اکون من
المومنین ٥ وان اقم وجھک للدین حنیفا ولا تکونن من المشرکین٥
ولا تدع من دون اللہ مالا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذا من
الظلمین ٥ وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف له الا ھو وان یردک بخیر
فلا راد لفضله ط یصیب به من یشاء من عبادہ وھو الغفور الرحیم٥ ۱۰۴-۱۰۷

آخری فیصلہ کن اعلان

'قل یا ایھا الناس ..... الآیہ' اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آخری فیصلہ کن اعلان کرایا جا رہا ہے تاکہ کفار کے ذہن کے کسی گوشے میں اگر کوئی طمع خام اس قسم کی ہو کہ دباؤ ڈال کر آپ کو کچھ نرم کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں وہ کر گزریں۔ اس قسم کا اعلان آخری مرحلے میں تمام انبیاء سے ماثور ہے اور یہ درحقیقت قوم سے رسول کا اعلان برارت ہوتا ہے جس کے بعد ہجرت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ 'الذی یتوفکم' کی صفت کا حوالہ یہاں بطور تنبیہ و تذکیر ہے یعنی وہی خدا جو تمہیں وفات دیتا ہے اور جس کے آگے جواب دہی کے لیے لازماً تمہیں حاضر ہونا ہے۔ 'وامرت ان اکون من المومنین' یعنی مجھے جو حکم ملا ہے وہ یہی ہے کہ میں مومن و موحد بنوں اس سے قطع نظر کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔

'وان اقم وجھک .. الآیہ' یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے۔ ایمان کی اصل خصوصیت اللہ واحد کی طرف یکسوئی اور شرک کے تمام شوائب سے پورا پورا اجتناب ہے۔

'ولا تدع من دون اللہ .... الآیہ' یہ شرک کے باطل ہونے کی دلیل ہے کہ جب اذن الٰہی کے بغیر نہ کوئی چیز نفع پہنچا سکتی ہے نہ ضرر تو اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو پکارنا اپنے نفس پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ خدا کے بھی سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے۔

'وان یمسسک اللہ .... الآیہ' اوپر والی بات ہی کی وضاحت ایک دوسرے اسلوب سے جس سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے جن کی بنا پر مشرکین شرکاء و شفعاء کو پوجتے تھے۔ آخر میں 'غفور رحیم' کی صفات کے حوالہ سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جب خدا خود مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے تو بندے اسی کے دامن رحمت میں پناہ لیں، دوسروں کا سہارا کیوں ڈھونڈھیں!

قل یا ایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم ج فمن اھتدی فانما یھتدی
لنفسه ومن ضل فانما یضل علیھا وما انا علیکم بوکیل٥ ۱۰۸

آخری تنبیہ

خطاب ہر چند باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے جن سے اوپر سے خطاب چلا آ رہا ہے۔ یہ گویا اس سلسلہ کی آخری تنبیہ ہے کہ یہ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ تمہارے رب

کی طرف سے ہے اور بالکل حق ہے جو تعلیم تمہیں دی جا رہی ہے یہ بھی حق ہے اور دنیا اور آخرت میں اس کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی خبر دی جا رہی ہے وہ بھی شدنی ہے تو اچھی طرح کان کھول کے سُن لو کہ جو اس حق کو قبول کرے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو اس کے بعد بھی بھٹکتا رہے گا تو اس بھٹکنے کا وبال اسی کے سر پر آئے گا، کسی دوسرے کے سر پر نہیں جائے گا۔ اور یہ بھی سن لو کہ میرے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ بس اس حق کو پہنچا دینے کی ہے، اس کو تم سے منوا لینے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

واتبع ما یوحیٰ الیک واصبر حتی یحکم اللہ وھو خیر الحاکمین۔ ۱۰۹

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سلسلہ کی آخری ہدایت ہے کہ مخالفین کے رویہ سے قطع نظر کر کے اس وحی کی تم پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے اور یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے۔ اس فیصلہ کی طرف اشارہ اوپر آیت ۱۰۳ میں گزر چکا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور اہل ایمان کو کامیابی عطا فرماتا ہے اور ان کے مخالفین رسوا و نامراد ہوتے ہیں۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے بضاعت کے قلم سے سپرد قرطاس ہوئیں جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحیح نکلی ہیں اور جو باتیں کمزور یا غلط ہیں وہ میری کم علمی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا

تدبر قرآن

از مولانا امین احسن اصلاحی

عمدہ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت میں۔ بڑا سائز یعنی ۱۸×۲۲/۸ کے دو سو صفحات پر مشتمل مضبوط جلد اور دبیز آفسٹ پیپر کے خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ۔ قیمت -/۶ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور۔ ۱۲۔ افغانی روڈ۔ سمن آباد لاہور

مقالات

سید صدیق حسن مرحوم

جمع و تدوین قرآن

(۲)

اب ہم اس آخری مرحلہ کی طرف آتے ہیں جو ان میں سب سے زیادہ نازک، وقت طلب اور روایات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے مشکل نظر آتا ہے، اسی لیے اس مسئلہ پر ہمیشہ سے اختلاف رائے رہا ہے اور ہر دور میں صاحبانِ علم کے دو گروہ رہے ہیں، ایک کا خیال ہے کہ سورتوں کا نظم توقیفی ہے، دوسرا اس کے برعکس رائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک سورتوں کے نظم کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سپرد فرمادیا تھا، اس لیے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا سورتوں کا باہمی نظم خود حضور اکرمؐ نے فرمایا تھا یا نہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ پر غور کرنے کی ابتدا زید بن ثابتؓ کی ایک مشہور روایت سے کی جائے جو بخاری میں ہے، اس کے متعلقہ الفاظ حسب ذیل ہیں :-

ان زید بن ثابتؓ قال ارسل	زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ حضرت
الیّ ابوبکر الصدیق مقتل اهل	ابوبکرؓ نے مجھے طلب فرمایا۔ اس وقت جنگ
الیمامۃ فاذا عمر بن الخطاب	یمامہ ہو رہی تھی۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب بھی
عندہ فقال ابوبکر ان عمر اتانی	آپ کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ
فقال ان القتل قد استحرّ یوم الیمامۃ	نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے اور یہ کہا

بقراء القرآن و انی اخشیٰ ان
استحر القتل بالقراء فی المواطن
فیذهب کثیر من القرآن وانی
اری ان تامر بجمع القرآن فقلت
لعمر کیف نفعل شیئا لم
یفعله رسول الله صلی الله علیه
وسلم قال عمر هو والله
خیر فلم یزل یراجعنی حتی
شرح الله صدری لذالك
ورأیت فی ذالك الذی رای
عمرؓ، قال زید - قال ابوبکر!
انك رجل شاب و عاقل لانتهمك
وقد کنت تکتب الوحی لرسول الله
صلی الله علیه وسلم فتتبع
القرآن اجمعه فوالله لوکلفونی
نقل جبل من الجبال ما کان
اثقل علیّ مما امرنی به من
جمع القرآن - قلت کیف تفعلان
شیئا لم یفعله رسول الله
صلی الله علیه وسلم قال هو
والله خیر، فلم یزل ابوبکرؓ
یراجعنی حتی شرح الله صدری
للذی شرح الله صدر ابی بکرؓ
وعمرؓ -

رہے ہیں کہ جنگ یمامہ قراء کے لیے بہت
شدید ثابت ہو رہی ہے، مجھے اندیشہ ہے
کہ زیادہ قراء کا قتل ہو جائے اور
بہت سے حفاظ ختم ہو جائیں گے، اس
لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن کے جمع
کا حکم دیجئے، میں نے عمرؓ سے کہا کہ میں
ایسا کام کیسے کروں جس کو رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، عمرؓ نے
کہا کہ بخدا یہ خیر کا معاملہ ہے، اور وہ
برابر مجھ سے اصرار کرتے رہے، تا آنکہ
اللہ نے مجھے اس کے متعلق شرح صدر کر دیا
اور میری بھی اس بارہ میں وہی رائے
ہو گئی جو عمر کی ہے، زید نے کہا کہ ابوبکر
نے فرمایا کہ تم عاقل اور نوجوان شخص ہو، تم
پر کوئی اتہام بھی نہیں ہے اور تم وحی بھی
لکھا کرتے تھے، اس لیے قرآن کو تلاش کرو
اور اس کو جمع کرو۔ زید کہتے ہیں کہ بخدا اگر
مجھے پہاڑ کا بوجھ اٹھانے کے لیے بھی کہتے
تو قرآن کریم جمع کرنے کے مقابلہ میں وہ ہلکا
کام ہوتا، میں نے کہا تم لوگ اس کام کو کیسے
کرتے ہو جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہیں کیا، انہوں نے کہا کہ بخدا اس میں
بہتری ہے۔ حضرت ابوبکرؓ مجھ سے برابر
کہتے رہے یہاں تک کہ اس ذات نے میرا بھی سینہ
اس بات کے لیے کھول دیا جس کیلئے ابوبکرؓ و عمرؓ کا
شرح صدر کیا تھا۔

فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال و وجدت اخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع غیره "لقد جاءکم رسول" من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم" حتی خاتمة البراءة، فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاه الله ثم عند عمر حیاته ثم عند حفصة بنت عمرؓ [1]

چنانچہ میں نے تمام قرآن کو عسیب اور لخاف اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ آخری سورہ توبہ کو ابو خزیمہ انصاریؓ کے پاس پایا اس کے علاوہ اور کسی کے پاس مجھے وہ سورہ نہیں ملی، "لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم" سے لے کر براۃ کے خاتمہ تک، یہ صحیفہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا، یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی، پھر حضرت عمرؓ کے پاس ان کی زندگی تک رہا۔ پھر حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس رہا۔

اس روایت کے جو خاص الفاظ قابل توجہ ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) حضرت عمرؓ کا قول:

انی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح لڑائیوں میں قراء قتل ہوتے رہے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ کا قول:-

فتتبع القرآن فاجمعه،

قرآن کو تلاش کرکے اسے جمع کرو۔

(۳) حضرت زید بن ثابتؓ کا قول:

فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال .... فکانت الصحف عند ابی بکرؓ

تو قرآن کی تلاش شروع اور اس کو عسیب، لخاف سے اور لوگوں کے سینوں سے جمع کیا... یہ صحف حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا۔

[1] (بحوالہ اتقان سیوطی ج ۱ ص ۵۹ مطبوعہ ازہریہ مصر)

اس روایت کے سلسلہ میں چند باتیں قابلِ غور ہیں، حافظ ابن حجر اس روایت کی تشریح میں لکھتے ہیں:-

وقتل فی عضون ذالک من الصحابۃ کثیرۃ قیل سبعمائۃ وقیل اکثر	اس لڑائی کے دوران میں بہت سے صحابہ قتل ہوئے، کہا جاتا ہے کہ سات سو یا اس سے زیادہ۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

ووقع من تسمیۃ القراء الذین اراد عمر فی روایۃ سفیان بن عیینۃ المذکورۃ قبل سالم مولی ابی حذیفۃ ولفظہ فلما قتل سالم مولی ابی حذیفۃ خشی عمر ان یذھب القرآن فجاء الی ابی بکر وسیاتی ان سالمًا احد من امر النبیؐ باخذ القرآن عنہ (فتح الباری ج ۹ ص۔)	سفیان بن عیینہؒ کی روایت میں حضرت عمرؓ نے سالم مولیٰ ابوحذیفہ کے قتل سے پہلے جن مقتول قراء کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا نام مذکور نہیں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہ قتل ہو گئے تو عمر کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا، اس وقت وہ ابوبکرؓ کے پاس آئے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، سالم ان صحابہ میں سے ایک تھے جن سے رسول اللہ نے قرآن حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس کے بعد "فیذھب کثیر من القرآن" کی تشریح میں لکھتے ہیں:-

فی روایۃ یعقوب .... من الزیادۃ الا ان یجمعوہ وفی روایۃ شعیب قبل ان یقتل الباقون	یعقوب کی روایت میں الا ان یجمعوہ کا فقرہ اور شعیب کی روایت میں قبل ان یقتل الباقون کا فقرہ زیادہ ہے۔

اس وضاحت و تشریح کے بعد ایک چھوٹے سے جزئیہ پر ذہن صاف کر لیجئے، یمامہ کی جنگ میں کوئی سات سو یا اس سے زیادہ صحابۂ کرام شہید ہوئے، سفیان کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کو "ذھاب قرآن" کا جو خدشہ ہوا وہ زیادہ تر سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ کی شہادت کی وجہ سے ہوا، اس لئے کہ سالمؓ ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جن سے نبی اکرمؐ نے "اخذ قرآن" کی اجازت دی تھی۔ اس لیے شعیب کی روایت کے مطابق قرآن کو جمع کر لینا ضروری تھا، قبل اس کے کہ "باقون" کا بھی وہی حال ہو جو سالم کا ہوا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جمع کرنے کا سب سے بڑا سبب حضرت سالمؓ

کی شہادت تھی، کیونکہ وہ اُن صحابہ میں تھے جن کو قرآن پڑھانے کی اجازت آنحضرتؐ نے مرحمت فرمائی تھی، شعیب کی روایت اس کا مزید ثبوت ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ہر مسلمان کو خواہ وہ کسی درجے کا ہو، قرآن کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور یاد ہوتا تھا، نماز تلاوت قرآن کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی، اور وہ بھی دن میں پانچ نمازیں، اس لیے ہر مسلمان کی یادداشت میں کتنا ہی چھوٹا حصہ سہی، قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور محفوظ ہوتا تھا، صحابہ کرام میں تو بہت سے ایسے تھے جنہیں پورا قرآن یاد تھا، اور دنیا کی کوئی چیز ان کے اس عزم و ارادہ میں حائل نہ ہوتی تھی، اگر وہ دن میں "فرسان" ہوتے تھے تو راتوں میں "رہبان" شب زندہ دار، اور تمام اشغال و اذکار میں تلاوت قرآن سب سے افضل اور بالاتر ذکر تھا، اور وہ بھی ایسی قوم کے افراد جو غیر معمولی حافظہ کی مالک تھی، اس لیے یہ یقین ہے کہ ان سات سو بزرگوں میں جنہوں نے یمامہ میں جام شہادت نوش کیا، بہت سے ایسے خوش نصیب رہے ہوں گے جنہیں پورا قرآن یاد تھا، ان سے زیادہ تعداد ان حضرات کی ہو گی جو بقید حیات اور پورے قرآن کے حافظ تھے، حضرت عمرؓ کو ۶۹۹ حضرات کی شہادت سے "ذہاب قرآن" کا اتنا اندیشہ نہیں ہوا جتنا اس ہستی کی شہادت سے ہوا جسے نبی اکرمؐ نے تعلیم قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، اس صفت سے وہ بزرگ بھی متصف تھے، جن کی طرف شعیب نے اپنی روایت میں "باقون" کے لفظ سے اشارہ کیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ کے بعد بھی حفاظ قرآن صحابہ کی کافی تعداد باقی رہ گئی تھی۔

اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس کتاب کے ساتھ لوگوں کو ایسا شغف ہو جیسا کہ اصحاب رسول اللہ کو قرآن کے ساتھ تھا اور جس کو حفظ کرنا سعادت دارین سمجھا جاتا رہا ہو، تو یہ عقلاً ناممکن ہے کہ اس کے دائرہ کو کوئی بڑی سے بڑی آفت بھی مٹا سکتی تھی، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ جیسے فطین و فرس بزرگوں پر یہ تہمت ہرگز نہیں لگائی جا سکتی کہ ایسی کھلی ہوئی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی، اور انہیں یہ گمان ہوا کہ اگر اسی طرح اور لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی شہادت ہوتی رہی تو ایک دن وہ آ سکتا ہے، جب پورے قرآن کا حافظ روئے زمین پر نہ رہ جائے اور کثیر من القرآن ضائع ہو جائے۔

اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ "ذہاب قرآن" کا خدشہ اس وجہ سے تھا کہ اگر سالمؓ کی طرح اور جو باقی حضرات [illegible] تھے جنہیں آنحضرتؐ نے تعلیم قرآن کی اجازت عطا فرمائی تھی، وہ اگر جہاد [illegible] جیسی ہو گئے تو قرآن پڑھانے [illegible] اور جو نسخے ان بزرگوں کے پاس ہیں ممکن ہے، وہ بھی ضائع [illegible] ہو جائیں کیونکہ یہ نسخے ذاتی اور شخصی [illegible] تھے اور ان کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری شخصی اور انفرادی

تھی، پوری قوم یا سلطنت کی نہ تھی،

صرف ایک طریقہ سے اس خطرہ کو دور کیا جاسکتا تھا وہ یہ تھا کہ ان بزرگوں کے تعاون سے کلام مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کرا کے خلافت میں لے لیا جائے۔

استیعاب[1] میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمرؓ سے کسی نے کہا کہ ایک شخص کوفہ میں یاد سے قرآن پڑھاتا ہے، یہ سن کر آپ غضب ناک ہوئے، مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ عبداللہ بن مسعودؓ ہیں تو آپ خاموش ہو گئے۔

اس روایت کے دو پہلو قابل ذکر ہیں۔

پہلا رخ تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ یاد سے پڑھانے والے پر غضبناک ہوئے، یعنی آپ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ لوگ قرآن کو بغیر دیکھے ہوئے پڑھائیں۔

اب ذرا ذہن کو پیچھے کی طرف لیجائیے اور یاد کیجئے کہ عہد نبویؐ میں قرآن پڑھانے والے مختلف قبیلوں اور قریوں میں بھیجے جاتے تھے، اس لیے یہ قیاس غالب ہے کہ ان بزرگوں کے پاس کلام مجید کا لکھا ہوا حصہ ہوتا تھا، جس کو دیکھ کر وہ کلام مجید کا درس دیتے تھے، اگر بلا دیکھے ہوئے درس دینے کا رواج آنحضرتؐ کے زمانے میں ہوتا تو حضرت عمرؓ اس پر غضبناک نہیں ہو سکتے تھے۔

دوسرا رخ اس روایت کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ زبانی درس دینے والے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں تو آپ خاموش ہو گئے۔ اس لئے کہ حضرت ابن مسعود ان چند نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کو آنحضرتؐ نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ صاف صاف نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے کہ قرآن کا درس زبانی صرف وہی حضرات دیں جن کو آنحضرتؐ نے درس قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی ہو، بقیہ حضرات لکھے ہوئے قرآن کو دیکھ کر پڑھائیں۔

اس پس منظر میں حضرت عمر کے خدشہ پر غور فرمائیے تو جو بات میں نے اوپر عرض کی ہے، اس کی مزید تائید ملے گی، ایسے بزرگ جنہیں حافظہ سے قرآن پڑھانے کی اجازت ہو، حضرت عمرؓ کے نزدیک وہی ہو سکتے تھے جن کو خود سرکار دو عالمؐ نے اجازت دی ہو اور ایسے نفوس قدسیہ بہت تھوڑے تھے۔ ان میں سے ایک جنگ یمامہ میں کام آچکے تھے، بقیہ بھی اگر اسی طرح سدھار جاتے تو پھر حضرت عمرؓ کے

---

[1] استیعاب ج ۱ ص ۳۷۷ بحوالہ تاریخ القرآن عبداللطیف رحمانی۔

نقطۂ نظر سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہ جاتا جو اس فریضہ کو انجام دے سکے۔ ان کے بعد وہی لوگ رہ جاتے جو لکھے ہوئے قرآن کو دیکھ کر پڑھا سکیں۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مقصد کے لیے قرآن کے مکتوبہ نسخے کو لوگوں کی ذاتی کوشش پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس شخص سے چاہیں اور قرآن کا جو جزو چاہیں لکھ لیں اور جس طرح چاہیں لکھ لیں اور اس کے ذریعہ درس و تدریس شروع کر دیں، اس کا جو نتیجہ ہوتا اس کے لئے کسی باریک بینی کی ضرورت نہیں، ایک نہیں ہزاروں کلام پاک کے نسخے تیار ہو جاتے کوئی "مالك يوم الدين" لکھتا، کوئی "ملك يوم الدين" کوئی "مليك يوم الدين" وقس علیٰ ہذا، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا طرز تحریر اور رسم الخط ہی کا اختلاف فتنہ کا سبب بن جاتا۔

اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس وقت کلام مجید میں کچھ ایسے الفاظ ہیں جو خلاف قیاس (رواج) لکھے گئے ہیں، مگر جس طرح بھی لکھے گئے آج تک اسی طرح قائم ہیں، کیونکہ ان کی سند صحابہ رضوان اللہ تک پہنچتی ہے۔

اب انہیں کسی قیمت پر اور کسی آسانی کی خاطر بھی بدلا نہیں جا سکتا اور نہ بدلنا چاہیئے، یہ حزم و احتیاط جو مسلمانوں نے کتاب اللہ کے متعلق برتی ہے۔ سوائے اس صحیفۂ خداوندی کے کسی اور صحیفہ کے ساتھ نہیں برتی گئی، یہاں تک کہ حدیث جو کلام اللہ کے مابعد آتی ہے، اس میں بھی یہ احتیاط نہیں ہے، اور یہ احتیاط شروع ہی سے کلام مجید کے متعلق ملحوظ رکھی گئی ہے:

غرض ۱۲ھ کی جنگ یمامہ کے بعد حالات حسب ذیل ہیں:

کچھ حضرات کے پاس ان کے ذاتی لکھے ہوئے کلام مجید کے نسخے تھے، مگر ان میں سے کوئی بھی مستند نسخہ نہیں تھا، بہت سے حضرات لکھے ہوئے مصاحف سے قرآن کا درس دیتے تھے، اور قرآنی درس کی ضرورت اسلام کا دائرہ بڑھنے کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی، اس لئے اغلب گمان یہ ہے کہ جیسے اور جہاں سے بھی بن پڑتا ہوگا لوگ کلام مجید کی نقلیں حاصل کر لیتے ہوں گے، اور اپنے طریقہ (رسم الخط) سے لکھ لیتے ہوں گے۔

ان حالات میں اگر معمولی فہم و فراست کے انسان کے سامنے بھی یہ مقصود ہو کہ ایک کتاب کے جو نسخے بھی تیار ہوں وہ بعینہٖ و بجنسہٖ حتیٰ کہ رسم الخط میں بھی ایک جیسے ہوں تو وہ کونسی راہ عمل اختیار کرے گا، اس کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے یعنی "ایک مستند نسخہ اس کتاب کا تیار کر کے اسے رائج کرنا"

ایک اور روایت بھی اس سلسلے میں پیش نظر رہے تو مفید ہوگی، کنز العمال میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ صحت تلفظ کا بھی بڑا اہتمام کیا تھا اور ہر جگہ تاکیدی حکم بھیج دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ صحت اعراب کی تعلیم بھی دی جائے۔ اور یہ بھی حکم تھا کہ جو شخص علم لغت کا ماہر نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے

(اسوۂ صحابہ ج ۲ ص ۲۲۹، ۱۹۵۵ء ایڈیشن)۔

یہ ذہنیت بھی بلا واسطہ اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا تذکرہ ایک پیراگراف پہلے کیا گیا ہے اور اس کا پھر اعادہ کیا جاتا ہے، وہ راہ عمل یہ تھی کہ "قرآن کا ایک مستند نسخہ تیار کرا لیا جائے اور اُسے رائج کیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ یہ مستند نسخہ حکومت کی نگرانی ہی میں تیار ہو سکتا تھا اور حکومت ہی کے قبضہ و حفاظت میں رہ سکتا تھا تاکہ اس سے بوقت ضرورت استفادہ کیا جا سکے۔

دوسرا ٹکڑا جو نظر میں رکھنا ضروری ہے وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہدایت ہے کہ قرآن کا تتبع اور "فاجمعہ" اسے جمع کرو۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ کا بیان ہے کہ "میں نے تتبع کیا اور قرآن کو عسب، لخاف اور صدور رجال سے جمع کیا۔"

اس میں خاص لفظ "جمع" کا ہے، جس کے لغوی معنی ضم اور تالیف کے ہیں۔ عبداللطیف اس سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ "جمع" سے مراد کتابت ہے، اس لیے کہ یہ ضم اور تالیف کے ہم معنی ہے۔ (تاریخ القرآن صہ ۴۸) ممکن ہے اس رائے سے کسی کو اتفاق نہ ہو، لیکن اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ جمع کے معنی اکٹھا اور یکجا کر دینے کے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کو جمع کر دو، اکٹھا یا یکجا کر دو، اس سے بادی النظر میں خیال ہو سکتا ہے جیسا کہ اکثر حضرات کو ہوا ہے کہ قرآن مرتب و منضبط نہ تھا، بلکہ منتشر اور پراگندہ تھا، اس لئے اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کرنے کا حکم دیا، لیکن محتاط لوگ اور مسلمان محققین عموماً اس قول کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ قرآن تو مکمل تھا، اور جہاں تک سورتوں کا تعلق ہے مربوط اور منضبط بھی تھا لیکن کسی ایک جگہ لکھا ہوا بین الدفتین نہ تھا۔

اتقان میں سیوطی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو [قال] الخطابی

انما لم یجمع صلی اللہ علیہ	صرف نبی کریمؐ نے قرآن کو مصحف کی شکل
وسلم القرآن فی المصحف ...	میں جمع نہیں کیا تھا .... قرآن کل کا کل
وقد کان القرآن کتب کلہ فی	رسول اکرمؐ کے عہد میں لکھا تو جا چکا تھا
عہد رسول اللہ لکن غیر مجموع	لیکن یکجا نہیں تھا اور سورتیں مرتب نہ
فی موضع واحد ولا مرتب السور	تھیں۔

(الاتقان، مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۵۸-۵۹)

آگے چل کر صفحہ ۶۰ کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے :-

(وقال) الحارث المحاسبی فی کتاب فهم السنن کتابة القرآن لیست بمحدثة، فانه صلی الله علیه وسلم کان یأمر بکتابة ولکنه کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخها من مکان الی مکان مجتمعا وکان ذلک بمنزلة اوراق وجدت فی بیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فیها القرآن منتشر فجمعها جامع وربطها بخیط حتی لا یضیع منها شئ

حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ: قرآن کی کتابت کوئی جدید بات نہیں تھی اس لیے کہ نبی کریم ؐ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا تھا، لیکن وہ رقاع واکتاف اور عسیب میں متفرق ومنتشر طور پر لکھا ہوا تھا۔ ابوبکر صدیق ؓ نے اسے مرتب طریقے سے یکجا لکھنے کا حکم دیا، اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پائے گئے تھے، ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا، اسی کو جامع نے جمع کرادیا اور ایک تاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس میں سے کوئی بھی حصہ ضائع نہیں ہوا۔

غالباً اسی سے متاثر ہو کر اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے قرآن لکھ رکھا تھا، ان کے قرآن کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی کھجور کے پتوں پر لکھا ہوا تھا، کوئی پتھروں اور ٹھیکروں پر، کوئی لکڑی کی تختیوں پر، کوئی رقاع (چمڑے) پر کوئی اونٹ کی پسلیوں پر، الغرض کوئی ایسی اطمینانی حالت نہ تھی کہ اس کے بہت دن تک محفوظ رہنے کی امید ہو۔"

"سب سے پہلے یہ خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیدا ہوا کہ قرآن کو ایک شیرازہ میں ہو جانا چاہیئے اور یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جبکہ جنگ یمامہ میں جو آنحضرت ؐ کے انتقال کے بعد ہی ہوئی تھی، بارہ سو قراء اور حفاظ قرآن میں سے سات سو مقتول ہو گئے، انہوں نے سوچا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن ہے یا وہ لوگ جو اس کے حافظ و قاری ہیں، اگر اسی طرح ان کا خاتمہ ہو گیا تو قرآن ضائع ہو جائے گا۔" (تاریخ القرآن۔ اسلم)

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے اس امر کے یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اس زمانے میں بہت سے قراء اور حفاظ تھے۔ ان کے علاوہ انصار میں کم از کم چار بزرگوں کے پاس لکھا ہوا پورا قرآن موجود

تھا، اس لیے مجھے اس بد گمانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ قرآن صرف پراگندہ طریقوں سے پتوں، لکڑی کی تختیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا، اور ایسی کوئی اطمینانی حالت نہ تھی کہ اس کے بہت دنوں تک محفوظ رہنے کی امید ہو۔

یہ مانا کہ لکھا ہوا قرآن سب کا سب کاغذ پہ لکھا ہوا نہیں تھا۔ فرض کر لیجئے کہ زید بن ثابتؓ کا قرآن صرف رقاع یا اونٹ کی پسلیوں ہی پر لکھا ہوا تھا، حالانکہ ایسا فرض کر لینے کی کوئی معقول دلیل نہیں پھر بھی اتمام حجت کے لیے اس کو مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سب لکھا ہوا مرتب تھا یا نہیں یعنی یہ رقاع اونٹ کی پسلیاں کسی ایک ترتیب سے تھیں یا یونہی بے ترتیب تھیں، اور کیا یہی حال بقیہ اور حضرات کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا تھا،

اگر تھا تو یہ جو روایت ملتی ہے کہ زیدؓ کا مصحف ابن مسعودؓ کے مصحف سے ترتیب میں مختلف تھا، یہ کیسے متعین ہو سکا۔

اس روایت سے سرسری طور پر نہ گذر جائیے، میرے خیال میں یہ بڑی اہم روایت ہے،

اتقان صفحہ ۶۵ پہ آخری سطر میں قال ابن اشتہ سے جو روایت شروع ہوتی ہے، اس میں مصاحف ابی ابن کعب اور عبداللہ بن مسعودؓ کی سورتوں کی نام بہ نام ترتیب دی ہوئی ہے، مثلاً

"تالیف مصحف ابی، الحمد ثم البقر، ثم النسا ثم آل عمران"

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف کی ترتیب سور بھی دی ہے، اس میں خاص لفظ جس پہ دھیان رکھنا ہے وہ "ثم" کا ہے، یعنی ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ، اسی طرح پورا مصحف مرتب اور منظم تھا۔ اس روایت کے ماننے والوں پہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ ترتیب سوران دونوں ترتیبوں سے مختلف ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ ترتیب مصاحف جو ان بزرگوں نے کی، وہ کس وقت کی، حضرت زیدؓ کی ترتیب کے بعد یا پہلے۔

اگر یہ ترتیب پہلے تھی تو پھر اس نظریہ سے انکار ناممکن ہے کہ کم از کم ان دو حضرات کے پاس کلام مجید مرتب تھا، یعنی قرآن کی سورتیں ایک خاص نظم کے ساتھ تھیں، ایسا نہیں تھا کہ قرآن مجید غیر مرتب تھا یعنی سورتوں میں باہم ترتیب نہ تھی۔

دوسری بات ان روایتوں کے متعلق یہ بھی ثابت ہے کہ ان حضرات کو اپنی ترتیب پہ اصرار بھی تھا۔ یہ دونوں حضرات یہ سمجھتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ ان کی ترتیب ہی صحیح ترتیب ہے، اور اس سے الگ دوسری

ترتیب ان کے لئے قابل قبول نہیں ہے،

ایسا کیوں تھا؟ کیا یہ حضرات سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنی رائے سے جو ترتیب دی ہے وہ ایسی ہے کہ اب اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، کیا ان کو اپنی رائے پر محض اس وجہ سے اصرار تھا کہ انہوں نے چونکہ خود اپنے اجتہاد سے ایک نظم اور ایک ترتیب قائم کی ہے۔ اس لیے اب کسی دوسرے کو اس ترتیب کے خلاف سورتوں کی ترتیب دینے کا حق حاصل نہیں ہے،

اس "اجتہاد ذاتی" پر آخر اس قدر شدت سے اصرار کی وجہ کیا تھی، بظاہر اس کے خلاف اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کو یقین تھا کہ یہی ترتیب خود ذات گرامی نے فرمائی تھی، اگر یہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں تھی، بلکہ خود مجتہد کا اپنا اجتہاد تھا تو کسی مخصوص ترتیب کی کوئی وجہ کیوں بیان نہیں ہوئی، یہ ظاہر ہے کہ یہ ترتیب زمانہ نزول کے لحاظ سے نہیں ہے، پھر اگر ترتیب میں اجتہاد ہو سکتا ہے تو ربط مضمون کے لحاظ سے ہو سکتا ہے، مگر اس کا بھی کوئی تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔

ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی سامنے رکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ سے تالیف قرآن کے لئے کہا گیا، تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں وہ کام کیسے کروں جو خود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا، کیا حضرت ابی ابن کعبؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی ذہنیت اس سے مختلف تھی، کوئی معقول وجہ اس مفروضہ کی نظر نہیں آتی۔

اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے مصاحف کی جو ترتیب تھی وہ ان کے یقین کے مطابق وہی ترتیب تھی جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

اگر یہ ترتیب حضرت زیدؓ کے جمع قرآن کے بعد ہوتی تو یہ نقطۂ نظر اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے یقین کے مطابق زیدؓ کی ترتیب ترتیب نبوی سے مختلف تھی، اس لیے انہوں نے زیدؓ کی ترتیب کو نہیں مانا بلکہ اس ترتیب پر مصر رہے، جو ان کے علم و یقین کے مطابق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

غرض دونوں صورتوں میں یہ بات پایۂ یقین کو پہنچتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورتوں کی ترتیب فرما دی تھی، اور قرآن اپنی تمام و کمال سورتوں کے ساتھ ایک مرتب اور منظم حالت میں وصال نبوی کے وقت موجود تھا، اسے اور واضح طور پر سمجھنے کے لیے ایک دوسرے پہلو سے غور فرمائیے، فرض کیجئے کہ قرآن کی آخری دس صورتیں اونٹ کی پسلیوں پر ایک ایک کر کے لکھی ہوئی تھیں۔ ان سورتوں کو ا۔ ب۔ ج تک موسوم کر لیجئے، ان پسلیوں پر ۱۰ تک ہندسے ڈال لیجئے، اگر یہ پسلیاں ایک صحیفہ کا جزو ہیں تو لازم ہے

کہ یہ پسلیاں ایک سے دس تک مرتب ہوں یعنی سورتیں الف سے ی تک ابجد ہوز کے ربط سے مرتب اور متعین ہوں اگر ایسا نہیں ہے تو ہر مرتبہ جب آپ اپنے اس مجموعہ سے قرآن پڑھنا شروع کریں گے۔ مثلاً تراویح کے موقع پر تو ہر مرتبہ ایک نئی شکل اور نئی ترتیب قرآن کی نظر آئے گی، اور ان ترتیبوں کے امکانات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں جیسا کہ آگے آئے گا لاکھوں تک پہنچیں گی۔

اس لئے جب تک یہ پسلیاں ایک نظام کے ماتحت مربوط نہ کر دی جائیں اس وقت تک ناممکن ہے کہ آپ ان سے ایک مصحف کے قسم کی کوئی چیز تیار کر سکیں، مصحف کا نام ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس چیز پر کلام مجید لکھا ہوا تھا، وہ سب ایک نظم میں مربوط اور منسلک تھا، اس لیے لوگوں کو یہ کہنے میں تکلف نہ ہوا کہ زیدؓ کا مصحف ابن مسعودؓ کے مصحف سے مختلف تھا۔

اگرچہ میں خود اس روایت کو ماننے کے لیے تیار نہیں، جیسا کہ بعد میں عرض کیا جائے گا، لیکن ان روایات سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ یمامہ کی جنگ کے پہلے بھی کچھ حضرات صحابہ کرام کے پاس قرآن کے مرتب مصاحف موجود تھے، اور ان میں سورتیں بھی منضبط طریقہ پر تھیں۔

دوسری واضح بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر احتیاط فرماتے تھے کہ نزول وحی کے فوراً بعد کسی کاتب کو بلا کر نازل شدہ آیات کو لکھا دیتے پھر اس کو پڑھوا کر سنتے۔ زیدؓ بن ثابت کا بیان ہے۔ "فان کان فیہ سقط اقامہ" اگر کوئی چیز لکھنے سے چھوٹ جاتی تو اس کو رسول اللہؐ درست کراتے، ثم اخرجہ الی الناس اس کے بعد اشاعت کا عام حکم دیتے، (مجمع الزائد، بحوالہ تدوین قرآن ص۲۸) کیا ایسے حزم و احتیاط کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو گوارا فرما سکتے تھے کہ جو لکھا گیا ہے اور جس کی عام اشاعت ہو چکی ہے اس کو غیر منظم اور غیر مربوط حالت میں چھوڑ دیا جائے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیئے کہ وحی کو محفوظ کرنے کا شدید جذبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تھا، اس کی حفاظت کا وعدہ تو خود ذات باری نے کیا تھا مگر اس کی تعمیل آپ کو کرنی تھی۔ ورنہ وحی لکھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، امت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہدایت نامہ اور ایک مشعل زندگی آپ کو چھوڑنا تھی۔ عرضہ آخیرہ یعنی آپ نے جب آخری مرتبہ حضرت جبرئیل کو پورا قرآن سنایا، جس کے کوئی چھ مہینہ بعد حضور کا وصال ہوا اس وقت حدیث فاطمہؓ کے مطابق آپ کو "حضر اجل" یعنی قرب وصال کا خیال ہو گیا تھا، اس چھ مہینہ کی مدت میں بھی آپ نے کوئی ضرورت اس امر کی محسوس نہ فرمائی کہ یہ دیکھ لیں کہ جو خداوندی کتاب آپ امت کے لیے چھوڑ رہے تھے وہ ایک منضبط اور مربوط طریقہ پر مرتب ہو چکی ہے یا نہیں۔ اور اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائیں کہ بعد کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ "ہاں! قرآن تھا تو لکھا ہوا ضرور مگر ایسی اطمینانی حالت

اس کی نہ تھی کہ اس سے یہ امید کی جائے کہ ایک مدت کے لیے باقی اور محفوظ رہ سکے گا: اگر اس کو ایک شیرازہ میں جمع کرکے تاگے میں سی لیا جائے تو اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہ جائے گا۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ کے انسان سے بھی ایسی فروگذاشت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

تدوین قرآن میں غلام ربانی لکھتے ہیں :۔

"جو کتاب قرآن کی طرح تدریجی طور پر مکمل ہو رہی ہے اس کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا، بلکہ قرآنی صورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنہیں مصنفین اپنی پیش نظر تصانیف کے لیے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں، اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اس کی تائید میں ازالۃ الخفاء سے حضرت شاہ ولی اللہ کا حسب ذیل مقولہ پیش کرتے ہیں :

"مثل آں کہ منشی منشات خود را یا شاعر قصائد و قطعات خود را در بیاضہا و سفینہا مندرج سازد۔"

ان کی رائے میں قرآن کچھ اس طرح مرتب ہوتا تھا کہ فرض کر لیجیے کہ سورۃ "الف" کی دو آیتیں آج نازل ہوئیں وہ پہلے اونٹ کی پسلی ۱ پر لکھ لی گئیں۔ دوسرے دن سورہ "ب" کی دو آیتیں نازل ہوئیں وہ پسلی ۲ پر لکھ لی گئیں، تیسرے دن سورۃ الف" کی دو اور آیتیں نازل ہوئیں وہ پسلی ۳ پر لکھ لی گئیں، چوتھے دن سورہ "ج" کی کچھ آیتیں نازل ہوئیں وہ پسلی ۴ پر لکھ لی گئیں اور پھر کاتبان وحی جن کی تعداد ۴۲ بتائی جاتی ہے وہ "حول النبیؐ" جمع ہوئے اور "تولف القرآن فی الرقاع" کا کام یوں شروع کیا کہ ان سب پسلیوں کو دیکھا اور جو آیت جس سورہ کی تھی اسے وہاں لکھ لیا، اس طرح ایک مصحف تیار ہوگیا جو "رقاع" چرمی قطعات پر لکھا جاتا تھا۔ مجھے اس رائے کے بلا کم و کاست ماننے میں تامل ہے۔

اولاً یہ کہ تالیف قرآن اور "منشآت"، "قصائد و قطعات" کو بیاض میں لکھنے اور پھر اس سے مضمون یا قصیدہ ترتیب دیتے ہیں، یہ فرق ہے کہ اول الذکر یعنی تالیف قرآن میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں ہوسکتی تھی، صرف آیتوں کی جگہ میں تبدیلی ہوسکتی تھی، اس کو یوں سمجھیے کہ بلاتشبیہ "اقرأ" کی پانچ آیتیں جو پہلے اتریں وہ لکھ لی گئیں، چھٹی آیت جب نازل ہوگی تو لکھ لی جائے گی، ممکن ہے کہ اس کی جگہ چار نمبر پہ قرار پائے، اس طرح پہلے کی پانچویں آیت بعد میں چھٹی آیت ہوجائے، یہ تو ممکن ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اقراء باسم ربک الذی خلق میں کوئی تبدیلی واقع ہوسکے، اور نعوذباللہ اس کی جگہ اقراء باسم اللہ العظیم لکھا جاسکے۔

جو لوگ قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک تو تالیف قرآن میں اس پہلو سے کوئی دقت نظر نہیں آتی، ہاں نسخ ماننے والوں کے لیے یہ بڑا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر آیت ہی بعد میں بدل گئی تو ایک دقت اور پیش آئے گی۔

لیکن ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی مان لیجئے، نفس مسئلہ میں اس سے کوئی خاص الجھن نہیں پیدا ہوتی، تالیف قرآن کی تاریخی روداد یہ ہے، فرض کر لیجئے کہ سورہ بقرہ کی کچھ آیتیں ایک دن اتریں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کاتب وحی، مان لیجئے زیدؓ بن ثابت کو وہ آیتیں لکھادیں اور اس کو پڑھوا کر سن لیا، اور اس کے بعد اس کی نقل دوسرے صحابہ نے بھی کر لی، پھر کچھ اور آیتیں اتریں، کچھ سورہ بقرہ کی اور کچھ آل عمران کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی ان کا مقام متعین کر کے لکھوا دیا، ان کو پڑھوا کر اور سن کر ان کی اشاعت کی اجازت دے دی، اب آپ غور کیجئے کہ اوپر والی مثال میں جو محض فرضی اور قیاسی ہے، جب سورہ بقرہ کی گیارہویں آیت لکھی گئی تو آنحضرتؐ نے اسے سنا، سوال یہ ہے کہ کیا صرف اسی ایک آیت کو سنایا اس کے پہلے کی جو دس آیتیں تھیں ان سب کو یا کم سے کم وہ آیت جو گیارہویں آیت کے متصلاً واقع ہے، اس کو بھی سنا، ظاہر ہے کہ محض گیارہویں آیت سننے سے یہ تو متعین ہو سکے گا کہ آیت صحیح اور پوری کی پوری لکھی گئی، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیت اپنے مقام یعنی گیارہویں جگہ پر لکھی گئی یا نہیں، جب تک کہ کاتب کے پاس پہلے کی دسوں آیتیں لکھی ہوئی نہ ہوں اور اس کا ربط ان آیتوں کے ساتھ نہ ہو سکے۔

یہ تو ممکن ہے کہ جس وقت کہ گیارہویں آیت لکھی جا رہی ہو، عین اسی وقت بقرہ کی دسوں آیتیں یا دسویں آیت موجود نہ ہو، لیکن ناممکن ہے کہ لکھانے والا صرف اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ بعد کو گیارہویں آیت کو پچھلی دس آیتوں سے ملا لیا جائے اور خود اس بات کو نہ دیکھے کہ واقعتاً وہ اپنی جگہ پر لکھ بھی گئی یا نہیں۔

مانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ نہ سکتے تھے لیکن لکھا ہوا پڑھواتے اور سنتے ضرور تھے۔ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ نزول وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کسی کاتب کو لکھا دیتے یا اس کا مقام بتا دیتے، وہ کاتب آنحضرتؐ کے پاس بیٹھکر لکھ لیتا اور اپنے قرآن کو بالکل آخری نازل شدہ ترتیب کے ساتھ "تالیف" کر لیتا، اس طرح ہر کاتب کے پاس جو نسخہ ہوتا وہ اپ ٹو ڈیٹ ہوتا، یہ سارا قرآن لوگ زبانی یاد کرتے، لکھ کر اپنے پاس رکھتے، اس کی تلاوت کرتے اور رمضان میں ہر سال ایک بار اس وقت تک نازل شدہ مکمل قرآن کو دہرا لیتے، خود غلام ربانی طبرانی کی روایت کان جبریل

املی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اترنے کے ساتھ ہی جبرئیل کے سامنے رسول اللہؐ نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیا کرتے تھے۔

صرف لکھوانے پر قناعت نہیں فرماتے تھے، بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو پڑھوا کر سنتے، جب یہ کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا تھا، جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے، اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، (ص ۲۸)

آگے چل کر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

تو لف القرآن .... میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے، بلکہ جن جن سورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دیکر لکھا کرتے تھے، جن پر ان کو ہونا چاہیئے تھا، بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہی لکھا ہے کہ المراد تالیف ما نزل من الآیات المفرقۃ فی سورھا وجمعھا (ص ۳۷)

متن میں لکھتے ہیں کہ:

"مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے ہیں، ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کرام کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے مکمل ہوتے رہے۔"

یہ رائے اس سے متعارض معلوم ہوتی ہے جس کا اظہار غلام ربانی صاحب نے اس کے پہلے کیا ہے۔

خلافت صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابتؓ نے قرآن کا جو نسخہ تیار کیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں، ایسی حالت میں یہ عجیب بات ہے کہ اس مکتوبہ ذخیرے میں صرف سورہ "برأۃ" کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں ان کو نہ مل سکی، حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں، بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے کے عام رواج کی بھی روایت ملتی ہے۔

یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے صحیح ہو سکتی ہیں کہ عام صحابہ کرام تو روزانہ اپنے صحائف مکمل کرتے جاتے تھے، مگر خود کاتب وحی زید بن ثابتؓ اپنا نسخہ مکمل نہیں کر سکے، اور نہ آنحضرتؐ کو اس کی فکر ہوئی کہ ایک مکمل نسخہ تیار ہو جائے، اور وصال نبویؐ کے ایک سال گذرنے کے بعد جب حکومت کو فکر ہوئی کہ ایک مکمل نسخہ تیار ہو جائے، تو زیدؓ کو پورا قرآن نہیں ملتا بلکہ اس کے ٹکڑے ملتے ہیں، جن سے وہ ایک اپنا نسخہ ترتیب دیتے ہیں، یا تو حیات طیبہ میں کوئی

نسخہ مکمل مدون ہوا ہی نہیں اور اگر ہوا تو ہر طرح مکمل رہا ہوگا، اور اسی ترتیب سے تھا، جیسا کہ اب ہے۔

دوسری بات جس کا اعادہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ اگر بالفرض زیدؓ نے ان لکھی ہوئی یادداشتوں سے ایک مکمل نسخہ تیار کیا اور ان یادداشتوں میں سے ایک یادداشت گم تھی تو اس سے اس کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ کچھ اور یادداشتیں اسی طرح غائب ہو گئی ہوں اور نہ مل سکی ہوں۔

سورۂ برأۃ کی آخری آیتوں والی حدیث پر انشاء اللہ آگے بحث کی جائے گی۔ اس موقع پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر یہ روایت صحیح مان بھی لی جائے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ علاوہ زیدؓ کے نسخے کے جو پوری طرح مکمل تھا، یہ آیتیں انہیں خزیمہ انصاریؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی ملی تھیں، گویا یاد تو بہتوں کو رہی ہوں گی۔

دوسری بات قابلِ گزارش قرآن مجید کے ساتھ صحابۂ کرام کا ذوق اور شغف ہے، وہ اس کو زبانی یاد کر لیتے تھے، دن رات اس کو پڑھتے تھے، بعض ایسے حضرات بھی تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص جو ایک رات میں پورا قرآن ختم کرتے تھے، جو صحابہ قرآن کو لکھ لیتے تھے اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

قرآن کو یاد اور اس کی تلاوت کرنے کا ایسا والہانہ شوق اور اس کے ابلاغ کا اس قدر شدید جذبہ ان میں تھا کہ لکھی ہوئی آیت نہ صرف لکھنے والے ہی کے پاس لکھی رہ جاتی تھی، بلکہ آناً فاناً بہت سے بزرگوں تک پہنچ جاتی جو اس کو یاد اور اپنے اوراد میں شامل کر لیتے۔

گویا بات، روز روشن کی طرح عیاں ہے، پھر بھی دو ایک واقعات کا ذکر اس سلسلہ میں بے محل نہ ہوگا۔

تعلیم قرآن کا سلسلہ مکہ کے قیام کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، حضرت ابن ارقمؓ کے گھر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلاوت خانہ قائم کیا تھا، جہاں لوگ بیٹھ کر کلام پاک پڑھا کرتے تھے، مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ کو بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد مدینہ اس غرض سے آپ نے بھیجا تھا کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں مکہ ہی کے زمانۂ قیام کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی قرآن پڑھ رہے ہیں، عمر آتے ہیں، بہنوئی کو زدوکوب کرتے ہیں، جب زدوکوب کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، تو بہن سے کہتے ہیں کہ کیا پڑھ رہی تھیں، وہ جری خاتون کہتی ہیں تم ان لکھی آیتوں کو اس وقت تک نہیں چھو سکتے جب تک پاک نہ ہو لو۔ جب صحابۂ کرام کلام مجید کی تلاوت کرتے تو عورتیں گھروں سے نکل آتیں، لڑکے کھیل بھول جاتے، راہ گیر سننے کھڑے ہو جاتے، سخن سنج اعجاز بیان سے مسحور ہو جاتے، شیریں بیان شاعر شعر کہنا اور شعر سننا چھوڑ دیتے اور بالآخر مخالفین تک کو ہار مان کر کہنا پڑتا ما هذا الا اقول البشر، جو لوگ اب بھی ضد و مخالفت پر قائم رہے، انہوں نے

قرآن کا اعجاز دیکھ کر اس کو بلند آواز سے پڑھنے سے روک دیا۔

یہ تو مکہ کی زندگی اور مظلومیت کے دور کا حال تھا، جب مدینہ میں تشریف آوری ہوئی تو اصحاب صفّہ کے نام سے کوئی ستر اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مستقل جماعت کلام مجید پڑھنے اور پڑھانے کے لئے قائم کر دی گئی، مولانا عبدالسلام ندوی اسوۂ صحابہ میں لکھتے ہیں:

" ہجرت کے بعد مسجد نبوی میں ایک مستقل حلقۂ درس قائم ہوگیا اور اصحاب صفہ شب و روز قرآن مجید کی تعلیم وتعلّم میں مصروف رہنے لگے، سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاشانۂ نبوت سے برآمد ہوئے تو مسجد میں دو حلقے نظر آئے۔ ایک میں لوگ تلاوت و دعا کرتے تھے اور دوسرے حلقے والے تعلیم وتعلّم میں مصروف تھے، آپ نے فرمایا "دونوں نیک کام کر رہے ہیں، ایک گروہ تلاوت و دعا کرتا ہے، دوسرا قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، میں صرف معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں" یہ کہہ کر اسی حلقۂ درس میں بیٹھ گئے[1]

درس وتدریس کا یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا۔ مسند ابن حنبل میں ہے :-

فکانوا اذا جنّهم اللیل انطلقوا الی معلم فیہ رسوۃ اللیل حتی یصبحوا	جب رات ہوجاتی تو یہ لوگ کسی معلم کے پاس جاتے، وہ انہیں پوری رات درس دیتا تا آنکہ صبح ہوجاتی،

اور یہ سلسلہ صرف صفہ ہی تک محدود نہ تھا بلکہ انصار کا ہر گھر مہمان خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مکتب قرآنی بن گیا تھا۔ چنانچہ باہر سے جو مہاجر آتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار کے سپرد کر دیتے وہ مہمان داری کے ساتھ ساتھ اس دلسوزی سے ان کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے کہ لوگ نہایت شکر گزاری کے ساتھ واپس جاتے۔ چنانچہ وفد عبدالقیس آیا تو اس منت شناسانہ اعتراف کے ساتھ واپس گیا کہ

ان الانصار یعلمون کتاب ربنا و سنۃ نبینا۔	انصار ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے ہیں ۔

وفد بنو تمیم آیا تو مدت تک مدینہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔

نظام حکومت قائم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امراء و عمال مقرر فرمائے ان کا سب سے مقدم فرض کتاب اور سنت کی تعلیم دینا قرار پایا، استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ میں ہے :-

بعثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت معاذ بن جبلؓ کو آنحضرت صلعم نے

---

[1] اسوۂ صحابہ حصہ دوم ۲۲۵ [2] ایضاً

قاضیا الی الجند من الیمن	قاضی بنا کر یمن بھیجا، تاکہ لوگوں کو قرآن
لیعلم الناس القرآن و شرائع	اور شریعت اسلامی کی تعلیم دیں۔

الاسلام۔

اوپر لکھے ہوئے حقائق میں ایک بات اور یہ ملا لیجئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گردوپیش جو حضرات تھے اور جن کی تعداد انگلیوں پر شمار کر لیے جانے والے چند نفوس ہی نہیں تھے بلکہ ان کا ایک وسیع حلقہ تھا، ان حضرات کو جو شغف ذاتِ نبویؐ سے تھا، اس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی، بقول کارلائل "محمدؐ کے اصحاب کی محمدؐ کے ساتھ شغف کی مثال حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں ڈھونڈنا عبث ہے، جب عیسیٰؑ پر کڑا وقت پڑا تو ان کے حواری کام نہ آئے، اس کے برخلاف محمدؐ کے اصحاب نے محمدؐ کی حفاظت داہنے سے کی، بائیں سے کی، آگے اور پیچھے سے کی۔"

کسی واقعہ کی صحیح نوعیت متعین کرنے کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ جن حالات اور جس ماحول میں وہ واقعہ رونما ہوا ہے ان حالات کو تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی جائے، اس ماحول کو اپنا ذہنی ماحول بنانے کی سعی کیجئے۔ اسی ذہنی فضا کو اپنی ذہنی فضا بنائیے، پھر اس فضا میں واقعہ متعلقہ کی تصویر کشی کیجیے۔ تب کسی حد تک واقعہ کی روداد صحت کے ساتھ متعین کرنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

اس پس منظر کے لیے ان حالات پر غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گردوپیش جو حضرات ہیں ان کی قوت حافظہ بہت قوی ہے، وہ ہر چیز زبانی یاد رکھنے کے عادی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، لکھنا وہ کم درجے کی چیز سمجھتے ہیں، اور لکھتے ہیں تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودیٔ طبع کے لیے۔ ذاتِ نبویؐ سے ان حضرات کو شغف اور عشق سے بھی آگے اگر کوئی درجہ ہو سکتا ہے تو وہ ہے۔ اُس ذاتِ گرامی کی ادنی سے ادنیٰ ادا، ہلکی سے ہلکی جنبش لب دنیا و مافیہا کی گراں قدر سے گرانقدر متاع سے زیادہ عزیز ہے، اس کی ایک جنبش ابرو پر دونوں جہاں نثار کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک ایک بات کو اس لئے یاد رکھتے ہیں کہ اس کو حرزِ جان بنائیں، اسے اپنی زندگی میں سموئیں اور آنے والی نسلوں کے لیے سرمایہ سعادت چھوڑ جائیں، حتیٰ کہ وہ خود کہتا ہے کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ اس لیئے یہ حضرات ان اقوال و افعال کو قلمبند تو نہیں کرتے مگر زبان یاد رکھتے ہیں سلسلہ بسلسلہ اور سند بسند۔

یہ محض ایک عقیدت مند بات نہیں ہے، تاریخی حقیقت ہے، صرف دو تین واقعے اس سلسلہ میں پیش کروں گا۔

سب سے پہلا قصہ جنگ احد کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بڑی بی مدینہ میں رہتی ہیں، کوئی تین میل پہ احد کی لڑائی ہو رہی ہے، خبر سنتی ہیں کہ محمدؐ شہید ہو گئے، بے تاب ہو جاتی ہیں، گھر سے نکل میدان جنگ کی طرف چل پڑتی ہیں، راستے میں جو ملتا ہے اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پوچھتی ہیں، لوگ شوہر، بھائی، باپ کے مارے جانے کی خبر دیتے ہیں، اس خاتون پہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی دھن میں مست میدان کارزار کی طرف چہرۂ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی تلاش میں والہانہ چلی جاتی ہیں اور جب روئے مبارک پہ نظر پڑتی ہے تو کہتی ہیں

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا — اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

یہ گھر میں بیٹھنے والی خواتین کا حال تھا، جنہیں اتنا موقع خدمت نبویؐ میں حاضری اور کسب سعادت کا نہیں ملتا تھا، جتنا حضرات صحابہ کرامؓ کو ملتا تھا۔ اس سے نبویؐ صلعم سے ان بزرگوں کے شغف و انہماک کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز عشاء کے بعد تھوڑی دیر تک مقام بطحا میں استراحت فرما کر مکہ میں داخل ہوئے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ہمیشہ اسی مقام پہ کسی قدر سو لیتے تھے، پھر مکہ میں داخل ہوتے تھے۔ اسی طرح آپ اس سفر میں جہاں جہاں اترے تھے یا نماز پڑھی تھی وہ بھی وہاں ضرور اترتے اور نماز پڑھتے۔

حضرت ابو الدرداؓ جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے، ام الدرداؓ نے کہا کہ اس عادت کو ترک کر دیجئے ورنہ لوگ آپ کو احمق بنائیں گے (سمجھیں گے) بولے، میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ جب کوئی بات کہتے تو مسکرا دیتے۔

حضرت علیؓ ایک بار گھوڑے پہ سوار ہوئے، دائیں رکاب میں پیر رکھا، دعا پڑھی اور پیٹھ پہ بیٹھ گئے تو مسکرانے لگے۔ لوگوں کے پوچھنے پہ کہا کہ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔

ایک صحابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو قمیض کا تکمہ کھلا دیکھا، عمر بھر قمیض کا تکمہ کھلا رکھا۔ اس قسم کے اور بھی سینکڑوں واقعات ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام کے والہانہ عشق کے شاہد ہیں۔

اس ماحول اور اس ذہنیت کے پس منظر میں اس امر کا جائزہ لیجئے کہ کیا اس میں یہ ممکن تھا کہ اس ذات گرامی کی محبوب ترین چیز جسے وہ بڑے اہتمام سے لکھاتا ہے، لوگوں کو یاد کراتا ہے، ان سے یاد کیا ہوا سنتا ہے، خود انہیں اپنا یاد کیا ہوا ہر رمضان میں سناتا ہے، اس محبوب ترین چیز کو لوگ لفظ بلفظ حرف بحرف لکھیں تو مگر اس طرح کہ اس کے محفوظ رہنے کی کوئی قابل اطمینان حالت نہ ہو۔

اس کے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ اصحاب نبی کریمؐ میں بہت سے ایسے بزرگ تھے جنہیں قرآن زبانی یاد تھا اور جنہوں نے اس کو لکھ لیا تھا۔ اس میں وہ سات قراء بھی تھے جن کی قرأتیں متداول ہوئیں ان قرأتیں سے ہر ایک اپنی قرأت کی سند رسول اکرمؐ تک پہنچاتا ہے، اور انہی قرأتوں کی امت اسلامیہ آج تک پابند ہے۔

اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ سورۂ قیامہ کی آیت "وقیل من" کے بعد قاری تھوڑی دیر وقف کے لیے ٹھہرتا ہے۔ پھر "راق" پڑھتا ہے، حالانکہ ایسے اور بہت سے مواقع کلام مجید میں ہیں، جہاں اس قسم کا وقف نہیں ہوتا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مقام پر یہ ہلکا وقف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

غور کیجئے تو یہ بڑی اہم بات ہے، ایک قلیل جزئیہ کو اس احتیاط کے ساتھ یاد رکھنا اور اس کی پابندی اس طرح کرنا کہ آج پورے تواتر کے ساتھ یہ ذرا سی بات بھی بالکل ایک ہی انداز سے ساری ممالک اسلامیہ میں جاری ہے، اس ذہنیت کا پتہ دیتی ہے جس کو قرآن کی حفاظت سپرد کی گئی تھی اور جو ذہنیت اس معمولی چھوٹی سی بات کو چودہ سو برس سے اپنے سینے سے اس طرح لگائے ہوئے ہے کہ اس کا بدل جانا ناممکن ہے۔ اس سے یہ بدظنی رکھنا کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو یاد نہ رکھے گی جس ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مرتب کیا تھا، یہ بات کسی طرح دل کو نہیں لگتی۔ (جاری ہے)

مقام پر فائز ہیں۔

بقیہ: تذکرہ وتبصرہ (راہ نجات)

ایمان اور عمل صالح کے ان بنیادی تقاضوں کو بتمام و کمال پورا کرنے کے بعد پھر مسلسل تیئیس برس حضورؐ نے حق کی دعوت، اور ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کی کبریائی کے اعلان و نفاذ کی انتھک جدّوجہد میں صرف کئے۔ اور اس راہ میں ہر تکلیف سہی، ہر مصیبت کو برداشت کیا، ہر مشکل کو جھیلا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چنانچہ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی شدید ترین قید کی صعوبت بھی سہی۔ طائف کے بازاروں میں اوباشوں کی فقرہ بازی اور سنگ اندازی بھی برداشت کی، بدر و احد میں خود اپنے دندان مبارک کے علاوہ اپنے قریب ترین اعزّہ اور عزیز ترین جاں نثاروں کی جانوں کا ہدیہ بھی بارگاہِ ربّانی میں پیش کیا۔ اور تیئیس برس کی شبانہ روز محنت اور مشقت سے بالآخر حق کا بول بالا کر دیا۔ اور خدا کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر کے ہی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی! "فصلّی اللہ علیہ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا"۔ گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سورۂ والعصر کی مجسّم تفسیر ہے! فداہ ابی و امّی

تو حضرات! یہ ہے سورۂ والعصر کے مفہوم کی مختصر تشریح۔ اب آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیوں میں نے اسے قرآن مجید کی جامع ترین سورت قرار دیا تھا اور کیوں امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر لوگ غور و فکر سے کام لیں تو تنہا یہی مختصر سی سورت ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

سورہ ماقبل اور سورۂ مابعد سے تعلق

اب ذرا ایک نظر قرآن مجید میں اس سورۂ مبارکہ کی سابق اور لاحق سورتوں پر بھی ڈال لیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے رویّے کی درستی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے دل و دماغ میں کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار اور نفع و نقصان کا صحیح تصوّر نہ صرف یہ کہ جاگزیں ہو جائے بلکہ ہمیشہ مستحضر بھی رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر لازماً انسان کے سامنے ایک ہی چیز بطور مقصود و مطلوب رہ جاتی ہے اور وہ ہے مال و اسبابِ دنیوی کی بہتات اور کثرت کی طلب۔ جو اس کے دل و دماغ پر اس درجہ مسلّط اور مستولی ہو جاتی ہے کہ کائنات اور خود اپنی زندگی کی عظیم حقیقتوں سے غافل کر دیتی ہے اور غفلت کا یہ پردہ صرف موت ہی پر چاک ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی کیفیت کا بیان ہے اس سورۂ مبارکہ میں جو قرآن مجید میں سورۂ والعصر سے پہلے ہے یعنی سورۂ تکاثر۔

اور پھر اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ انسان صحیح و غلط میں بھی تمیز نہیں کرتا اور جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا فرق بھی بالکل اٹھا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ دولت کے انبار لگا لینے ہی کو اصل کامیابی سمجھ بیٹھتا ہے اور اخلاق کے تمام محاسن سے تہی دست ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت تمام معائب کی جامع ہو جاتی ہے تو اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اس سورت میں جو سورۂ والعصر کے بعد ہے یعنی سورۂ ھمزہ۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا اور آپ کا حشر ایسا ہو اور ہم اس انجام بد سے دوچار ہوں۔

خاتمۂ کلام

آخر میں میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان طویل گذارشات کو نہایت توجہ سے سنا۔ اور بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کی پہچان اور معرفت بھی عطا فرمائے اور اس پر عملاً قائم ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائے اور دوسروں کو اس کی طرف بلانے اور دعوت دینے کی ہمّت اور اس راہ کی مصیبتوں اور تکالیف پر صبر کی توفیق بھی ارزانی فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین!

روداد اجلاسِ عام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

منعقدہ ۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء بوقت ساڑھے دس بجے صبح

بمقام: ۱۲۔ افغانی روڈ۔ سمن آباد۔ لاہور

از قلم: چوہدری نذیر احمد ٹوہر، معتمد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

گوشوارہ حاضرین اجلاسِ عام وکل تعداد وابستگان انجمن:

انواعِ وابستگان	کل تعداد	حاضرین
مؤسسین	۲۰	۸
محسنین	۳	۱
مستقل ارکان	۵	۴
عام ارکان	۷۹	۵۲
میزان	۱۰۷	۶۵

۱۔ اجلاس ڈاکٹر اسرار احمد صدر مؤسس انجمن ہذا کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۲۔ اجلاس شدہ ایجنڈے کے مطابق سب سے پہلے حافظ عبدالواحد صاحب نے سورۂ منافقون کے پہلے رکوع کی تلاوت کی اور اس کا ترجمہ پیش کیا۔

۳۔ ایجنڈے کی شق ۲ کے ضمن میں:۔

اولاً۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اختصار کے ساتھ انجمن کے قیام کا پس منظر پیش کیا۔ انہوں نے واضح

کیا کہ یہ انجمن دراصل کچھ ایسے حضرات کے اشتراک باہمی سے وجود میں آئی ہے جو ایک ایسے شخص کی امداد اور اُس سے تعاون کرنا چاہتے ہیں جو پہلے سے اپنے طور پہ دین کی ایک حقیر سی خدمت میں مصروف تھا۔ اس طرح سے گویا کہ وہ شخص اور اس کا ماضی اس انجمن کا جزو لاینفک ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ اوائل عمر ہی میں ان کے دل میں علامہ اقبال مرحوم کے اشعار کے ذریعے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو پیدا ہو گئی تھی اور بانگِ درا کے رجائیت آمیز اشعار نے اسلام کے مستقبل کے بارے میں کچھ امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے تھے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے طور پہ انہوں نے فرمایا کہ مولانا حالی کی مسدس گویا کہ امتِ مسلمہ کے زوال کے آخری حد کو پہنچ جانے پہ انتہائی مایوسانہ نوحہ یا مرثیہ ہے۔ جس کی غمازی اس رباعی سے ہوتی ہے جو مسدس کا سرِ آغاز ہے یعنی:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس کے بعد علامہ اقبال کے اشعار نے نوجوانانِ ملت کے دلوں میں ایک نئی امید کے چراغ بھی روشن کئے اور انہیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک جذبۂ تازہ بھی عطا فرمایا۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ قیام پاکستان کے بعد۔ اپنے کالج کے زمانۂ تعلیم میں انہوں نے اپنے اس جذبۂ خدمتِ دین اور احیائے اسلام کے لیے جماعت اسلامی کے طریقِ کار کو نہایت موزوں پایا اور مسلسل دس برس اس کے ساتھ ایک فعّال کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعت کے بہت سے دوسرے سربرآوردہ لوگوں کی طرح انہوں نے بھی محسوس کیا کہ جماعتِ اسلامی کے ملکی سیاست میں حد سے زیادہ ملوث ہو جانے کے باعث اصل مقصد مجروح ہو رہا ہے۔ چنانچہ دوسرے کم و بیش ساٹھ ستر ارکان کے ساتھ انہوں نے بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اس کے بعد تقریباً دس برس کا عرصہ اس تگ و دو میں گزرا کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے

حضرات جن میں کئی نامور علمی شخصیتیں بھی تھیں کسی ہیئت تنظیمی میں منسلک ہو کر اپنے طور پر دین کی خدمت اور احیائے اسلام کی جدّ و جہد میں مصروف ہو جائیں۔ لیکن بہت سے اسباب سے جن کی تفصیل کی یہاں کوئی حاجت نہیں ہے یہ کوششیں ناکام رہیں۔

چنانچہ ۱۹۶۷ء میں بالآخر ڈاکٹر صاحب نے خود ایک راہ عمل متعیّن کی جو تفصیل کے ساتھ اس تحریر میں درج ہے جو اوّلاً ۱۹۶۷ء کے میثاق میں شائع ہوئی تھی اور اب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" نامی کتابچے کی صورت میں شائع شدہ موجود ہے۔ ساتھ ہی اوائل ۱۹۶۸ء سے ان خطوط پر عملی جدّ و جہد کا آغاز بھی تن تنہا کر دیا۔

اس کام کو اللہ تعالےٰ نے قبولِ عام سے مشرف کیا۔ اور ایک طرف حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا سلسلہ خوب پھلا پھولا خصوصاً سمن آباد لاہور کے حلقۂ درس کو اللہ تعالےٰ نے خصوصی کامیابی عطا فرمائی اور دوسری طرف "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت سلسلہ اشاعت کا آغاز ہو گیا۔

اواخر ۱۹۷۱ء میں یعنی پورے چار سال تک کسی بھی ہیئت تنظیمی کے بغیر کام کرنے کے بعد۔ دو وجوہات سے ایک ادارے یا انجمن کے قیام کی ضرورت کا احساس ہوا یعنی ایک[1]۔ اس سبب سے کہ چونکہ دارالاشاعت الاسلامیہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی ملکیّت تھا۔ لہٰذا اس کی مطبوعات کے خریدنے اور پھیلانے کی اپیل کرنے میں حجاب محسوس ہوا اور خیال ہوا کہ یہ مطبوعات کسی ایسے ادارے کے زیر اہتمام شائع ہونی چاہئیں جو کسی کی ذاتی ملکیّت نہ ہو اور جس سے کسی کی ذاتی منفعت وابستہ نہ ہو۔ اور دوسرے[2] اس خیال سے کہ قرآن اکیڈمی کے مجوزہ منصوبے کے لیے بہرحال کوئی باقاعدہ ادارہ ہونا ضروری ہے جس کے نام اس کے لئے زمین وغیرہ خرید کی جائے۔

چنانچہ رفقاء و احباب کے حلقے میں گفت و شنید اور باہمی مشوروں کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر مختلف مراحل سے گزر کر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام پر منتج ہوا جس کی باقاعدہ رجسٹریشن اواخر ۱۹۷۲ء میں ہو گئی اور جس کا پہلا باضابطہ اجلاسِ عام آج منعقد ہو رہا ہے۔

ثانیاً۔ میاں مقصود احمدؐ اختر نے انجمن کے مؤسّسین کے پہلے اجلاس منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء سے لے کر تا حال تمام اجتماعات کی کارروائی اور اب تک کے جملہ اقدامات اور تمام فیصلوں کی تفصیل پیش کی۔ اس ضمن میں صدر مؤسّس نے فرمایا کہ چونکہ انجمن کا پہلا اجلاس عام آج منعقد ہو رہا ہے اور پہلی مجلس منتظمہ کا باقاعدہ انتخاب آج ہو گا اور اب تک کی ساری کارروائی لاہور میں موجود مؤسّسین حضرات کے فیصلوں سے ہوتی رہی ہے لہٰذا مناسب ہے کہ یہ اجلاسِ عام ان تمام فیصلوں کی توثیق کر دے تاکہ بعد میں

کسی اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ اس پر دریافت کیا گیا کہ کسی شخص کو اب تک کے کئے گئے فیصلوں میں سے کسی پر اعتراض تو نہیں ہے؟ چنانچہ انجمن کے عام ارکان میں سے صرف ایک صاحب نے ایک خاص اقدام کے بارے میں وضاحت طلب کی اور وضاحت پیش ہونے پر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا۔ اس کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف سے کسی اور اقدام یا فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ اور اس طرح انجمن کے اجلاس عام نے ۲۹ اپریل ۱۹۷۳ء تک کے جملہ فیصلوں اور اقدامات کی توثیق کر دی۔

ثالثاً۔ انجمن کے اب تک کے حسابات کی تفصیل پیش کی گئی اور انجمن کے مرکزی حسابات اور مکتبہ اور الکلیۃ العربیہ کا میزانیہ آمد و خرچ پیش کیا گیا جو بالاتفاق رائے منظور کیا گیا (حسابات کی ایک نقل بھی اس رپورٹ کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کی جا رہی ہے)

۴۔ اس کے بعد ایجنڈے کی شق ۳ کے مطابق مجلس منتظمہ کے انتخاب کا مرحلہ آیا جس کے سلسلے میں متعدد حضرات کی جانب سے یہ اشکال پیش کیا گیا کہ انجمن کے وابستگان ابھی ایک دوسرے سے اتنے متعارف اور واقف نہیں ہیں کہ اس اہم ذمہ داری کو کما حقہٗ ادا کر سکیں۔ جب اس خیال پر شرکاء اجلاس کی اکثریت متفق نظر آئی تو دریافت کیا گیا کہ پھر کیا صورت اختیار کی جائے اس پر ایک تجویز جناب محمد عقیل صاحب (یکے از مؤسسین انجمن) کی جانب سے پیش ہوئی کہ لوگ خود اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے لیے پیش کر دیں۔ اس پر صدر مؤسس نے کہا کہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ محتاط اور پختہ کار لوگ تو خاموش رہ جائیں گے اور پرجوش لوگ اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔ حالانکہ انجمن کی مجلس منتظمہ کے لیے زیادہ ضرورت محتاط اور پختہ کار لوگوں کی ہے۔ حاضرین نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ بعد ازاں حاجی عبدالواحد (یکے از عام ارکان) نے تجویز پیش کی کہ انجمن کے ہر چہار انواع کے وابستگان میں سے مجلس منتظمہ کے لیے نمائندوں کا تعین خود صدر مؤسس کر دیں۔ اس لیے کہ وہی سب وابستگانِ انجمن سے سب سے زیادہ واقف اور ان کی صلاحیتوں وغیرہ سے سب سے زیادہ آگاہ ہیں۔ حاجی عبدالواحد صاحب کی اس رائے کو تمام شرکائے اجلاس نے بالاتفاق رائے قبول کر لیا۔ اس پر صدر مؤسس نے کہا کہ ان پر اس قدر بوجھ نہ ڈالا جائے لیکن جملہ حاضرین نے بیک زبان اس پر اصرار کیا۔

چنانچہ صدر مؤسس نے مجلس منتظمہ کے لیے مندرجہ ذیل بارہ حضرات کے نام تجویز کئے جو شرکائے اجلاس نے بالاتفاق رائے قبول کر لیے:

۱۔ مؤسسین انجمن میں سے:

(۱) جناب محمد عقیل صاحب، ۱۴۰۔ شارع شاہی۔ لاہور کینٹ۔

(۲) میاں محمد رشید صاحب - ۶۴ - رسول پارک، نیا مزنگ لاہور - (۳) میاں مقصود احمد اختر ڈھولنوال - لاہور (۴) جناب قمر سعید قریشی صاحب، سمن آباد - لاہور

۲ - محسنین انجمن میں سے :

(۱) ڈاکٹر کرنل نور احمد صاحب ایم آرسی پی - سمن آباد لاہور -

(۲) ملک فیض الحسن صاحب عباٹس شریف سکیم - سمن آباد - لاہور

۳ - مستقل ارکان میں سے:

(۱) رانا نور محمد صاحب - دھرم پورہ - لاہور

(۲) ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ - ایم بی بی ایس - وسن پورہ - لاہور

۴ - عام ارکان میں سے :

(۱) حاجی محمد یوسف صاحب ۴۴ - ۵۰ - این - سمن آباد - لاہور (۲) جناب نذیر احمد ڈوبر صاحب ۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور (۳) مختار حسین صاحب فاروقی ۱۲ - افغانی روڈ سمن آباد - لاہور (۴) جناب شاہ محمد ظفر صاحب - گڑھی شاہو - لاہور -

نوٹ اس طرح گویا صدر انجمن کو مجلس منتظمہ کے جن دو ارکان کو خود نامزد کرنیکا اختیار ہے اس کے تحت بھی صدر مؤسس نے دو حضرات کو عام ارکان کے حلقے ہی سے نامزد کر دیا !

۵ - آخر میں ایجنڈے کی شق ۵ کے مطابق دریافت کیا گیا کہ انجمن کے قواعد و ضوابط سے متعلق کوئی ترمیم یا کوئی اور تجویز جو کوئی صاحب پیش کرنا چاہیں پیش کر دیں -

انجمن کے قواعد و ضوابط سے متعلق نہ کوئی اعتراض پیش کیا گیا نہ ترمیم - اس طرح گویا انجمن کے پہلے اجلاس عام کی جانب سے انجمن کی قرارداد تاسیس اور اغراض و مقاصد اور جملہ قواعد و ضوابط کی کامل توثیق بھی ہو گئی ایک تجویز البتہ یہ پیش کی گئی کہ انجمن کی مجلس منتظمہ کے آج کے انتخابات کو انجمن کے قواعد و ضوابط کی دفعہ ۳ شق (ک) کے مطابق دو سال کے عرصے کے لیے قرار دینے کی بجائے صرف اس بار محض آٹھ ماہ کے لیے قرار دیا جائے اور انجمن کا دوسرا اجلاس عام اسی سال دسمبر کے اواخر میں منعقد کیا جائے اور اس میں جو مجلس منتظمہ منتخب ہو اسے متذکرہ بالا دفعہ کی رو سے پورے دو سال کے لیے سمجھا جائے - یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی -

۶ - بعد ازاں دعا پر اجلاس عام اختتام پذیر ہوا - اور اس کے بعد شرکائے اجلاس کی سادہ سی چائے کے ساتھ تواضع کی گئی - ❊

انجمن خدّام القرآن کراچی

تعارف اور رودادِ اجتماع مجلس عمومی

از قلم: شیخ جمیل الرحمٰن ۔ معاون معتمد، انجمن خدام القرآن کراچی

تعارف کراچی میں تحریک رجوع القرآن کا آغاز جنوری ۷۲ء میں ہوا تھا۔ چند مخلص اصحاب کی دعوت پر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہر ماہ کے آغاز میں کراچی تشریف لاتے تھے۔ ایک جمعہ کا خطاب اور تین چار دروس قرآن کا انتظام ہوتا تھا۔ دسمبر کے آخری عشرہ میں جمعیت الفلاح ہال میں دس روزہ قرآنی تربیت گاہ کا انعقاد ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے منتخب قرآنی نصاب تسلسل کے ساتھ پیش فرمایا۔

دسمبر ۷۲ء کے اواخر تک کراچی میں ماہانہ اجتماعات کا انتظام چند مخلص اصحاب انفرادی طور پر کرتے تھے۔ اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کام کو مزید وسعت دینے اور اس میں استحکام پیدا کرنے کے لیے کراچی میں ایک اجتماعی نظم قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر ۱۳ اور ۱۴ مارچ کو جمعیت الفلاح ہال کراچی میں دو اجتماعات ہوئے جس میں جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنا کتابچہ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام" اجتماعی مطالعہ کے لیے پیش فرمایا اور بعض مقامات کی تشریح اور توضیح کی۔ آخری اجتماع میں شرکاء نے فیصلہ کیا کہ کراچی میں دعوت رجوع الی القرآن کے لیے مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی ذیلی انجمن قائم کی جائے جس کی قرارداد تاسیس اور اغراض و مقاصد مرکزی انجمن کے مطابق ہوں۔ البتہ قواعد و ضوابط مقامی ضرورت کے مطابق بالکل علیحدہ طے کئے جائیں۔ اس فیصلہ کے بعد متیسرا اجتماع ۱۵ مارچ کو منعقد ہوا۔ جس میں ۲۷ حضرات نے شرکت فرمائی۔ اس اجتماع میں انجمن کے قواعد و ضوابط منظور کئے گئے اور طے پایا کہ رکن سازی کا آغاز کیا جائے اور جو حضرات ۱۶ اپریل تک رکنیت قبول کرلیں ان کا پہلا اجتماع (انجمن کی مجلس عمومی کے پہلے اجلاس کی حیثیت سے) ۱۶ اپریل ۷۳ء کو منعقد کیا جائے اور دستوری اور آئینی امور کی انجام دہی کرلی جائے۔

جمعیت الفلاح ہال میں ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو صبح کی نشست میں بالترتیب دو اجتماع عام منعقد ہوئے جس میں پہلے اجتماع میں "بعثت نبویؐ کا مقصد اور اس کے لیے حضورؐ کی جدوجہد کا خاکہ" کے موضوع پر اور دوسرے

اع میں" نبی اکرم کا طریق دعوت و اصلاح" کے موضوع پر جناب ڈاکٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ ہر خطیب
بًا ڈھائی گھنٹے کا تھا۔ شرکاء کی تعداد دو اور ڈھائی سو کے درمیان تھی۔

راد اجتماع مجلس عمومی

۱۶ اپریل ۷۳ء کو بعد نماز عصر انجمن خدام القرآن کراچی کی مجلس عمومی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے آغاز تک انجمن کی رکنیت کے لیے ۶۲ فارم ہائے
ت موصول ہوئے تھے۔ ان ۶۲ حضرات میں سے ۳۵ حضرات شریک اجلاس تھے۔ ۸ حضرات بطور ممبر شریک تھے۔
خطبہ مسنونہ کے ساتھ کارروائی کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے" تعارف
مد" کے عنوان کے تحت افتتاحی خطاب کیا۔ موصوف نے فرمایا:-

" میرے نزدیک مسلمانوں کے انحطاط کا اصل سبب دین سے بعد ہے اور دین سے دوری کی وجہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید سے بیگانگی اور بے تعلقی ہے لہذا احیاء اسلام اور دین کی نشاۃ ثانیہ کا خواب امّت مسلمہ میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک کے بغیر شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ منبع ایمان ویقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر اور اشاعت کا انتظام کیا جائے اور لوگوں کو رجوع الی القرآن کی دعوت دی جائے۔ اسی طریق اور منہج سے لوگوں کے عقائد و نظریات صحیح ہوں گے، ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح ہوگی، ان کے معاملات، ان کی معاشرت، ان کی معیشت درست ہوگی اور اسی کتاب کی تعلیمات اور دعوت کے ذریعے ہمارے ملک کے نظام سیاست وحکومت میں حقیقی اور مفید تبدیلی رونما ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۶۷ء سے میں نے تن تنہا لاہور میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام بخشا۔ یہ کتاب اللہ ہی کا فیضان ہے کہ یہ کام ایک فطری اور تدریجی رفتار سے بڑھتا رہا اور اس کی وسعت کے پیش نظر ضروری ہوا کہ یہ کام ایک ادارہ کے زیر اہتمام آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۷۲ء کے آغاز سے میں نے چند مخلص احباب کی دعوت پر ہر ماہ کے آغاز میں کراچی کی آمد کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۲، دسمبر ۷۲ء کو ایک دس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے انعقاد پر ختم ہوا۔ کراچی میں اکثر حضرات نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہاں بھی کسی ادارہ یا انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ منظم طریق سے کام کو آگے بڑھایا جائے چنانچہ اسی مقصد کے لیے یہاں کراچی میں انجمن خدام القرآن کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اور آپ حضرات اس کے پہلے اجتماع میں شریک ہیں ——— خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت میں عملی حصّہ لینے کے عزم کی توفیق

عطا فرمائی، ان کو اس توفیق پہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اس کا اجر بھی اسی سے ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی ان حضرات کو جنہوں نے خود کو عملی تعاون کے لیے انجمن کے رکن کی حیثیت سے پیش کیا ہے، یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس طرح ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ ان کے کاندھوں پہ آ گیا ہے جس کی ادائیگی کی ان کو ہر وقت فکر کرنی چاہیئے۔ انجمن کے ارکان اس کام میں کس طور پہ عملی تعاون کر سکتے ہیں، اس کے متعلق انشاء اللہ میں اختتامی تقریر میں اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا۔"[1]

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطاب کے بعد ایجنڈے کے مطابق کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچی جس میں اجلاس مؤسسین منعقدہ ۱۵ر مارچ ۷۲ء کی توثیق قرارداد تاسیس اور اغراض و مقاصد کی منظوری، قواعد و ضوابط کی منظوری، آڈیٹر کا تقرر اور مجلس منتظمہ برائے ۷۳ - ۷۴ء کا انتخاب شامل تھا۔ اس کارروائی کی تکمیل کے بعد جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے اختتامی تقریر کی[2] اور اس کے بعد دعا کے ساتھ یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

---

[1] (ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطاب کو مرتب نے NOTES کے ذریعے ضبط تحریر کیا ہے۔ الفاظ مرتب کے ہیں)

[2] ڈاکٹر صاحب کے اختتامی خطاب کے ضروری حصے انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کئے جائیں گے:

ماہنامہ محدث کے
خصوصی پیشکش - ایک جامع، مثالی اور علمی شاہکار
رسولِ مقبول نمبر منظرِ عام پر
مدیر اعلیٰ حافظ عبدالرحمٰن مدنی
مدیر: خواجہ عبدالرحمٰن راز
جس میں ملک کے مشاہیر اہل علم حضرات کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؔ اور قاضی سلیمان منصور پوریؒ کے غیر مطبوعہ نادر اور فکر انگیز مقالات ہدیۂ قارئین ہیں۔
صفحات ۱۶۰، سفید کاغذ آفسٹ طباعت قیمت ۴ روپیہ صرف۔ زر سالانہ: ۱۵ روپیہ
مستقل خریداروں کیلئے خاص رعایت ——— تاجر حضرات کیلئے معقول کمیشن
مجلس التحقیق الاسلامی، ۱۹ گارڈن ٹاؤن لاہور۔ ٹیلیفون: ۸۰۵۵۰

رفتار کار حلقہ ہائے مطالعہ قرآن
زیر اہتمام : انجمن خدام القرآن کراچی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تعمیل میں کہ " بلغوا عنی ولو آیۃ " " پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت " ۔ کراچی میں مندرجہ ذیل مقامات پر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے منتخب قرآنی نصاب کے درس کے ٹیپ سنائے جاتے ہیں ۔

۱۔ مسجد قدسی جیکب روڈ نزد ... جمشید روڈ ۲ ۔
ہر ہفتہ کو بعد نماز عشاء

۲۔ حسن ذی سلوا ٹاؤن ۔ شمالی ناظم آباد بر مکان جناب فیض رسول صاحب (B-124)۔
ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب ۔

۳۔ ناظم آباد نمبر ۵ بر مکان جناب [illegible] صاحب (V-A-2/2) ۔
ہر ہفتہ کو بعد نماز عشاء ۔

۴۔ عزیز آباد ۔ فیڈرل بی ایریا ۔ بر مکان جناب سرور صدیقی صاحب (89/A Block-8) ۔
ہر ہفتہ کو بعد نماز عشاء (ٹیپ سنانے کے بجائے درس قرآن کی مجلس منعقد ہوتی ہے) ۔

۵۔ دہلی کالونی بر مکان جناب سراج الرحمان صاحب (۲۲ ۔ گلی نمبر ۲) ۔
ہر جمعہ کی شب کو بعد نماز عشاء ۔

۶۔ پی-ای-سی-ایچ سوسائٹی بر مکان جناب مولانا [illegible] صاحب (207 A Block-2) ۔
ہر اتوار کو صبح دس بجے ۔

۷۔ فریئر روڈ ۔ آرام باغ میدان نمبر ... بر مکان جمیل الرحمان واقع ۲ ٹمبر سیشن ۔
ہر جمعرات کو بعد نماز عشاء ۔

۸۔ ... اسکول ، مولوی تمیز الدین خان روڈ ، بر مکان نمبر 124-125 ۔
ہر ہفتہ کو بعد نماز عشاء ۔

۹۔ رنچھوڑ لائن میں مختلف مساجد میں مختلف اوقات میں درس قرآن کے ٹیپ سنانے کا سلسلہ جاری ہے ۔

۱۰۔ گارڈن ویسٹ میں اللہ والی مسجد میں کیے گئے درس قرآن کے ٹیپ سنوائے جاتے ہیں ۔

مزید برآں ہر ماہ مرکزی اجتماع جمعیت الفلاح ہال صدر میں منعقد ہوا کرے گا ۔ جس میں انشاء اللہ العزیز جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب درس قرآن دیا کریں گے ۔

علاوہ ازیں حیدر آباد میں تقریباً آٹھ ماہ سے ہر ہفتہ کراچی سے ٹیپ جاتے ہیں اور وہاں ہر ہفتے دو تین مقامات پر ان کے سنوانے کا انتظام کیا جاتا ہے ۔

جمیل الرحمان ، معاون معتمد ، انجمن خدام القرآن کراچی

۳/۳۳ ، فرید چیمبرز ، عبداللہ ہارون روڈ ، کراچی ۔ ۳

Regd. No. L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore

Vol. 20 | JUNE 1973 | No. 6

گوشوارۂ آمد و خرچ

مرکزی انجمن خدام‌القران ۔ لاہور

از ابتداء تا ۳۰ اپریل ۱۹۷۳ء

	نام کھاتہ	آمد	خرچ
1.	ابتدائی زر تعاون مؤسسین	98,000 00	
2.	" " مستقل ارکان	10,000 00	
3.	" " محسنین	15,000.00	
4.	ماہانہ چندہ	4,685 00	
5.	عام عطیات	12.280,00	
6.	امانت	177 00	
7.	اخراجات بنک		2 40
8.	یونائیٹڈ بنک اکاؤنٹ نمبر 209 (CA I)		91,139.60
9.	" " " " 1115 (CA II)		8,271.84
10.	زکوٰۃ	1,000.00	
11.	کرایہ مکان و ٹیکس وغیرہ		5,000.00
12.	مکتبہ انجمن		31,802.50
13.	متفرق اخراجات		315 00
14.	اخبارات و رسالہ جات		33.30
15.	اشتہارات		342.50
16.	بیرونی اخراجات (بار برداری)		4.00
17.	سٹیشنری طباعت اخراجات		454 50
18.	الکلیۃالعربیۃ		2345.00
19.	تنخواہ عملہ		437.50
20.	ایمپرسٹ اکاؤنٹ		5000.00
21.	ڈاک تار اخراجات		3.25
22.	فرنیچر و فکسچر		80.00
23.	ٹیلیفون		83.80
24.	اخراجات سفر		11.05
25.	دفتری اخراجات		11.25
26.	ٹولز و پلانٹ		240.00
27.	بجلی اکاؤنٹ		23.75
28.	سوئی گیس		40.76
		1,41,142.00	1,41,142.00

(میاں) محمد رشید ، ناظم مالیات ، مرکزی انجمن خدام‌القران لاہور

پبلشر : محی‌الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ ۔ لاہور
مقام اشاعت : کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور